نے اس کو بہت خوشگوار اور دلچسپ بنا دیا ہے، اور وہ مختلف حیثیتوں سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لایق ہے،

**اساس عربی**۔ مولفہ پروفیسر نعیم الرحمن صاحب ایم اے تقطیع بڑی، ضخامت ۳۲۸ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت صر، پتہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، فریر روڈ، کراچی

عربی صرف و نحو کی پرانی کتابیں بہت طویل ہیں، اور ان کا طریقہ بھی پرانا ہے، گو فن میں کمال پیدا کرنے کے لیے وہ مفید ہیں، لیکن ان کی تعلیم میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے، وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کے لیے موزوں نہیں ہیں، بلکہ اب بہت سے عربی مدارس میں بھی صرف و نحو کی جدید طرز کی کتابیں، رائج ہو گئی ہیں، اسی ضرورت کے پیش نظر محمد نعیم الرحمن صاحب لکچرار عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی نے عرصہ ہوا، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ...... عربی طلبہ کے لیے مشہور انگریزی نحوی تھیچر کی عربی گرامر کے طرز پر صرف و نحو میں یہ کتاب لکھی تھی، جو اسی زمانہ میں چھپ گئی تھی، اب اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے، مصنف اگرچہ جدید تعلیم یافتہ ہیں لیکن صرف و نحو کی قدیم کتابوں پر بھی ان کی پوری نظر ہے، اور انھوں نے اس کتاب کی تالیف میں ان سے فائدہ اٹھایا ہے، اس لیے اس میں صرف و نحو کے تمام ضروری مسائل آگئے ہیں، اور وہ عربی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں دونوں کے طلبہ کے لیے کارآمد ہے،

**تفسیر ابن کثیر اردو**: تقطیع بڑی ضخامت ۴ صفحات، شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب فریر روڈ، آرام باغ، کراچی۔ قیمت تحریر نہیں، اسی پتہ سے ملے گی۔

حافظ عماد الدین ابوالفدا دمشقی المعروف بابن کثیر کی تفسیر جو اسی نام سے مشہور ہے، عربی کی بلند پایہ اور مستند تفسیر ہے، یہ مذکورہ بالا کتاب اسی کے بارھویں پارہ کا ترجمہ ہے، غالباً اس سے پہلے گیارہ پاروں کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے، جو ہماری نظر سے نہیں گذرا، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، مگر تفسیر ابن کثیر اور اس قسم کی دوسری تفسیریں درحقیقت تفسیری تحقیق کے کام کی ہیں، عام اردو خوانوں کیلئے زیادہ کارآمد نہیں، البتہ درس قرآن اور تفسیریں اس سے مدد لیجا سکتی ہے، اس حیثیت سے یہ ترجمہ مفید ہے،



جلد ۷۷ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۶ء نمبر ۳

## فہرست مضامین

# شذرات

گذشتہ مہینہ ایک بڑے اسلامی ملک کے فرمانروا رضا شاہ پہلوی نے ہندوستان کو اپنی میزبانی کی عزت
بخشی، ایران اور ہندوستان کے درمیان اتنے قدیم اور ایسے گوناگوں تعلقات ہیں اور ان میں اسقدر اشتراک
ہے کہ مشکل سے کسی دو ملکوں اور قوموں کے درمیان اتنا اشتراک ہو سکتا ہے، دونوں قومیں نسلاً ایک ہیں
دونوں کی زبانیں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں، انکی مشابہت سے آج بھی انکی قدیم وحدت کا پتہ چلایا جا سکتا ہے،
ایک زمانہ میں بدھ مذہب کا اثر ایران تک تھا، ان قدیم رشتوں کے علاوہ ہندوستان کے اسلامی دور خصوصاً مغل
کے سلاطین اور تیموریوں کے زمانہ میں ہندوستان ایران کا ایک خطہ بنگیا تھا، ایران کے اصحاب کمال کی آمد
کا ایک سلسلہ قائم تھا، اس دور کے ہندوستان کے بہت سے نامور ایرانی تھے جو آج بھی اسی سرزمین میں محو خواب ہیں،
فارسی ہندوستان کی علمی اور حکومت کی زبان تھی، ایرانی تہذیب نے ہندوستانی تہذیب کے ہر شعبہ پر اتنا اثر ڈالا ہے اور
یہ اثرات اس میں اسقدر پیوست ہو گئے ہیں کہ آج بھی ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا، ان دونوں تہذیبوں کے
میل سے ایک ایسی دلکش و دلفریب تہذیب وجود میں آئی جو اپنی لطافت و نفاست میں ہندوستان کی تمام تہذیبوں
میں ممتاز اور ہندو مسلمانوں کے اونچے طبقہ کی مشترک تہذیب ہے، ہندوستان کی زبان، اسکے ادب، فنون لطیفہ اور
تہذیب و معاشرت ہر چیز میں اسکا جلوہ نمایاں ہے، اسی تہذیب نے ہندوستان کو دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور حیدرآباد جیسے
تہذیبی مرکز، تاج محل جیسی عجوبۂ روزگار عمارت اور اردو جیسی حسین و جمیل زبان بخشی، مگر انگریزی عہد میں ان دونوں
ملکوں میں دوری ہو گئی تھی، تاہم تہذیبی اشتراک کا رشتہ قائم تھا، اسی رشتہ کے بدولت رضا شاہ نے ہندوستان
میں ایک خاص قسم کی یگانگت محسوس کی، انکی آمد سے ان قدیم رشتوں کی دوبارہ تجدید ہو گئی ہے، ہندوستان اور
اسلامی ملکوں کے تعلقات نہ صرف ان ملکوں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے بھی مفید ہیں، اسلیے شاہ ایران کی آمد ہر اعتبار
سے ہمارے لیے مبارک و مسعود ہے۔



افسوس ہے کہ آچاریہ نریندر دیو جی کی موت سے ہندوستان ایک بڑی شخصیت سے محروم ہو گیا، وہ اپنے اوصاف
کے لحاظ سے ہندوستان کے ممتاز ترین لیڈروں میں تھے، سیاسی خدمات، ایثار و قربانی، علمی قابلیت، بے تعصبی،
اور شرافت و وضعداری میں اس دور کے کم لیڈر ان کا مقابلہ کر سکتے تھے، وہ پنڈت جواہر لال کے پرانے رفیق
اور جنگ آزادی کے نامور سپاہی تھے، اس راہ میں پنڈت جی کے دوش بدوش قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں،
اردو، انگریزی، ہندی اور سنسکرت چاروں زبانوں میں ان کو عبور حاصل تھا، اور انکے بڑے اچھے مقرر تھے،
ان کا یہ کمال تھا کہ جب اردو یا ہندی میں تقریر کرتے تھے تو دوسری زبان کا ایک لفظ بھی نہ آنے پاتا تھا،
اودھ کی پرانی راجدھانی فیض آباد ان کا وطن تھا، اس لیے اردو ان کی مادری زبان تھی اور وہ بڑی فصیح و بلیغ
اردو بولتے تھے، علمی قابلیت اور تعلیمی تجربہ کی بنا پر لکھنؤ اور ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، متعدد کتابوں
کے مصنف تھے، ان سب سے بڑھکر ان کی بے تعصبی اور شرافت و وضعداری تھی، ہندوستان میں اسکے جو نمونے رہ گئے
ہیں ان میں سے ایک وہ بھی تھے، ایک زمانہ تک کانگریسی رہے پھر اس سے بددل ہو کر سوشلسٹ پارٹی قائم
کی، اگر وہ کانگریسی رہتے تو آج مرکزی حکومت کے وزیر ہوتے، مگر انھوں نے اپنے اصول و نظریات کے مقابلہ میں
دنیاوی منصب و جاہ کی کوئی پرواہ نہ کی، اب انکی جیسی شخصیتیں مشکل سے پیدا ہونگی، اسلیے انکی موت ایک بڑا قومی حادثہ ہے،

بالآخر اہل بہار نے بھی اردو کو اپنے صوبہ کی علاقائی زبان بنوانے کے لیے کئی لاکھ دستخطوں کا میمورنڈم
صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کر دیا، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بہار سے لیکر دہلی تک کا پورا علاقہ اردو کا خاص
وطن ہے، اس کی ساری نشو و نما اور ترقی یہیں ہوئی، اور آج بھی اس علاقہ کے بڑے حصہ کی زبان اردو ہے،
اس حقیقت سے خود صدر جمہوریہ بھی واقف ہیں، آج سے ۱۵، ۱۶ سال قبل اردو اور ہندی کے قضیے کو
طے کرنے کے لیے اردو اور ہندی دانوں کے درمیان جو مفاہمت ہوئی تھی، اس کے رکن رکین ہمارے
صدر جمہوریہ اور مولوی عبدالحق صاحب تھے، اور یہ مفاہمت "راجندر، عبدالحق پیکٹ" کے نام سے موسوم تھی،
اس لیے ان سے زیادہ اس مسئلہ کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے، مگر اب یہ مسئلہ آئینی ہو گیا ہے، اسلیے مرکزی حکومت
اور جن ریاستوں کے باشندوں کیجانب سے یہ میمورنڈم پیش کیے گیے ہیں انکی حکومتوں سے مشورہ کیے بغیر صدر جمہوریہ اسکا فیصلہ نہیں کر سکتے۔

جہاں تک اتر پردیش کا تعلق ہے، یہاں اردو کی مخالفت بہت کم ہوگئی ہے، اور اردو کے حامیوں کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے، حکومت کا رویہ بھی بدل چلا ہے، اس نے اردو کو کچھ تعلیمی حقوق بھی دیے ہیں، اتر پردیش کے وزیر اعظم کو اس کا بھی اعتراف ہے کہ "وہ اردو کو اسی ملک کی زبان سمجھتے ہیں، وہ اس صوبہ کے ہر ضلع میں بولی جاتی ہے، اس سے ان کو کوئی دشمنی نہیں، اور جو لوگ اس کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں اس کا وہ انتظام کریں گے"، مگر اس کے باوجود اردو کو اس لیے اس صوبہ کی علاقائی زبان بنانے کے لئے آمادہ نہیں ہیں کہ ان کے نزدیک کوئی ایسا علاقہ نہیں ہے، جہاں صرف اردو بولنے والے ہوں، اور ان کے مقابلہ میں ہر ضلع میں ہندی بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے، اس کے علاوہ دو لسانی ریاست بنانا اتر پردیش کے لیے مضر ہے۔

———•———

مگر ان دونوں دلیلوں میں کوئی وزن نہیں ہے، اولاً یہ بیان ہی صحیح نہیں ہے کہ ہر ضلع میں ہندی بولنے والوں کی اکثریت ہے، گذشتہ مردم شماری کے اعداد و شمار کا اعتبار نہیں، اسکی صحت اس سے ظاہر ہے کہ اس کی رو سے لکھنو جیسے شہر میں اردو بولنے والوں کی تعداد کل ۱۵ فیصدی ہے، لیکن اگر وزیر اعظم کا بیان صحیح بھی جان لیا جائے تو جب وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اردو ہر ضلع میں بولی جاتی ہے تو خواہ ان کے بولنے والوں کی تعداد ہندی بولنے والوں کے مقابلہ میں کم ہی کیوں نہ ہو اس کو لسانی اقلیت تو بہرحال ماننا پڑے گا، اسلیے اس کو وہی حقوق ملنے چاہئیں جن کی سفارش حدبندی کمیشن نے لسانی اقلیتوں کے لیے کی ہے، اس میں قریب قریب وہ تمام حقوق آگئے ہیں جن کا اردو والوں نے مطالبہ کیا ہے، اگر حکومت سرکاری طور پر ان کو اردو کیلیے مان لے تو اردو والوں کا مطالبہ پورا ہو جائیگا، حکومت کو کوئی مزید حق بھی نہ دینا پڑیگا، اور اردو کیلیے یہ سہولت پیدا ہو جائیگی کہ اسکی تعلیم وغیرہ میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ نہ پیش آئیں گی، پنجاب اور دوسری ریاستوں کے دو لسانی ریاست بنے کے بعد اس سے نقصان پہنچنے کا عذر بھی عذر لنگ ہو جاتا ہے، اگر دو لسانی ریاست بننے سے پنجاب کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، تو اتر پردیش کو کیوں پہنچے گا،



# مقالات

## اشاعرہ اور فلسفۂ یونان

از جناب مولوی مرزا محمد یوسف صاحب استاد مدرسۂ عالیہ رام پور

کلام اور فلسفہ میں چولی دامن کا ساتھ ہے، بالخصوص علم کلام میں اس وقت تک تبحر حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان فلسفے سے پوری طرح آشنا نہ ہو اور اس کے مالہ و ماعلیہ سے تفصیلی طور پر واقفیت حاصل نہ کرلے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب تک کوئی شخص معقولات کے گھر کا بھیدی نہیں ہو جاتا وہ متکلم نہیں بن سکتا،

یہ ممکن ہے کہ آدمی کلام سے کسی قسم کا سروکار رکھے بغیر فلسفہ کا پورا مطالعہ کرلے، گو اس قسم کی کوشش دشوار بھی ہے اور غیر مفید بھی، مگر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ فلسفہ کی ممارست کے بغیر علم کلام سے واقفیت حاصل ہو سکے، مگر کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بغیر فلسفہ دانی کے علم کلام آجاتا ہے، اور معقولات کے گھر کا بھیدی ہوئے بغیر آدمی علم کلام میں اس مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ متکلم کہلا سکے، چنانچہ ایک مشہور صاحب قلم نے امام ابوالحسن الاشعری اور ان کے متبعین کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

امام ابوالحسن الاشعری اور ان کے متبعین نے اس رو کو بدلنے کی کوشش کی، مگر یہ گروہ متکلمین کے علوم سے تو واقف تھا لیکن معقولات کے گھر کا بھیدی نہ تھا، اس لیے وہ اس عام بے اعتقادی

---

[1] یونانی فلسفہ کی مقبولیت

کی رفتار کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا ،،

اس انکشاف پر

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، ایک معمولی طالب علم بھی جس نے فلسفہ اور کلام کی درسیات کی تکمیل کی ہے، ایسا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، ایسا ایک شخص بھی نہیں مل سکتا، جس نے فلسفہ پڑھے بغیر علم کلام پر عبور حاصل کر لیا ہو، ایک طالب العلم ایسا نہیں ہے جس نے میبذی پڑھے بغیر شرح عقائد نسفی اور صدرا و شمس بازغہ کی تعلیم کے بغیر شرح مواقف پڑھ لی ہو، خود علم کلام کی متفق علیہ تعریف ہی یہ بتلاتی ہے کہ فلسفہ کی کمزوریوں پر مطلع ہوئے بغیر علم کلام میں گفتگو نہیں کی جا سکتی بلکہ فلسفہ کی کمزوریوں سے واقفیت ہی علم کلام کا کام ہے، مواقف میں قاضی عضد الدین الایجی المتوفی ۷۵۶ھ نے لکھا ہے :-

| | |
|---|---|
| والکلام علم یقتدر معہ | کلام وہ علم ہے جس کے ذریعہ انسان دلائل |
| علی اثبات العقائد الدینیۃ بایراد | وارد کر کے اور شبہات دور کر کے دینی عقائد |
| الحجج ودفع الشبہۃ | کے ثابت کرنے پر قادر ہوتا ہے ، |

ظاہر ہے کہ عقائد دینیہ میں جو کمزوری اور ان کے خلاف جو شبہات و اعتراضات ہوں، جب تک آدمی ان سے واقف نہ ہو، اس وقت تک ان کا رد کس طرح کر سکتا ہے، یہی علم کلام کی حقیقت ہے، جہاں تک عقائد دینیہ کے اعتقاد کا تعلق ہے، وہ ہر مسلمان کو بغیر علم کلام کے ایمان کے نتیجہ میں حاصل ہو جاتا ہے، شرح مواقف میں ہے

| | |
|---|---|
| واختار اثبات العقائد علی تحصیلہا | ماتن رحمہ اللہ نے تحصیل عقائد کے مقابلہ میں اثبات |
| اشعاراً بان ثمرۃ علم الکلام اثباتہا | عقائد کے لفظ کو ترجیح دی جس میں یہ اشارہ ہے کہ علم کلام |
| علی الغیر وان العقائد یجب ان | کا نتیجہ دوسروں کے مقابلے میں عقائد دینیہ کا اثبات ہے |



| | |
|---|---|
| یوخذ من الشرع لیعتد بہا | اور یہ کہ نفس عقائد کو شریعت سے اخذ کرنا چاہیے |

اس لیے غیر مسلموں کے مقابلہ میں ان عقائد دینیہ کا اثبات علم کلام کا مقصد ہے، جن کی بنیاد قضایائے کلیہ پر ہے، اور شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے، بلکہ وہ فلسفے سے ماخوذ ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا قدم اور اس کی توحید یا اجسام کا حدوث (تخلیق عالم) فنا کے بعد ان کا اعادہ (بعث بعد الموت) وغیرہ دینی عقائد کی اصل شریعت میں ہے، لیکن جواہر فردہ سے اجسام کا ترکب، جواز خلاء، انتفاء حال، اور معدومات کا عدم تمایز ایسے مسائل ہیں جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، مگر ان کے اثبات پر عقائد دینیہ کا اثبات موقوف ہے، اور ان مسائل سے واقفیت کے لیے فلسفہ اور اس کی کمزوریوں سے واقفیت ضروری ہے، اسی طرح عقائد دینیہ پر جو شبہات وارد کیے جاتے ہیں، ان کا ماخذ بھی فلسفیانہ فکر ہے، اور ان کا رد اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک آدمی ان فلاسفہ کی کمزوریوں سے واقف اور ان کے علوم معقولات کے گھر کا بھیدی نہ ہو۔

غرض علم کلام کے دو فریضے ہیں : اثباتِ عقائد اور دفع شبہات، اور دونوں کی ادائگی اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک آدمی فلسفہ کے صالح اور فاسد دونوں مسالک اور اس کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف نہ ہو، اس لیے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آدمی جب تک معقولات کے گھر کا بھیدی نہ ہو، وہ متکلمین کے علوم سے واقف ہی نہیں ہو سکتا، شرح عقائد میں ہے :-

| | |
|---|---|
| ثم لما نقلت الفلسفۃ عن الیونانیۃ | یعنی جبکہ فلسفہ یونانی زبان سے عربی زبان میں |
| الی العربیۃ وخاض فیہا المسلمون | ترجمہ ہوا اور مسلمانوں نے اس میں غور و خوض |
| وحاولوا الرد علی الفلاسفۃ فیما | شروع کیا اور فلاسفہ نے جہاں جہاں شریعت |
| خالفوا فیہ الشریعۃ فخلطوا بالکلام | کی مخالفت کی ہے، ان مقامات کے رد کرنے کا ارادہ کیا |

کثیروا من الفلسفة ليحققوا مقاصدها | تو کلام میں بہت سے فلسفہ کے مسائل خلط ملط کر دیے
فيتمكنوا من ابطالها | تاکہ وہ اسکے مقاصد کی تحقیق کر سکیں اور
اس طرح اس کے باطل کرنے پر متمکن ہو سکیں،

اس لیے علم کلام کی تدوین سے پہلے متکلمین کو حسب ذیل منازل سے گذرنا پڑا:

(۱) فلسفہ کا یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ

(۲) مسلمانوں کا فلسفہ کی مترجمہ کتابوں پر غور و خوض

(۳) فلسفہ کے مسالک فاسدہ کی تردید کی کوشش

(۴) کلام میں فلسفیانہ مسائل کا اختلاط

(۵) ان کے مقصد و منشا کی تحقیق کے بعد ان کا رد

اس لیے متکلمین نے اپنا فرض پوری طرح ادا کرنے کے لیے اول روز ہی سے فلسفہ کا تنقیدی مطالعہ
شروع کیا، چنانچہ اساطین معتزلہ مثلاً ابو الہذیل العلاف اور ابراہیم بن سیار النظام وغیرہ نے
جن کا علم کلام کی تاسیس و تدوین میں بڑا حصہ ہے، فلسفہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس فن کی
تدوین کی، ابو الہذیل اور نظام دوسری صدی ہجری کی شخصیتیں ہیں، تیسری صدی میں بھی یہی
انداز رہا، اس عہد کی بڑی شخصیتیں جبائی اور امام ابو الحسن الاشعری ہیں، امام اشعری جبائی
کے شاگرد تھے، جن پر معتزلۂ بصرہ کی ریاست ختم ہوئی، لیکن غالباً ۲۹۸ھ میں وہ اعتزال سے
تائب ہو گئے اور طریق اہلسنت کی نصرت و حمایت کو اپنا نصب العین بنا لیا، اور آخر دم
تک اس کی کوشش کرتے رہے، اسی لیے وہ تیسری صدی ہجری کے مجدد ملت شمار کیے جاتے
ہیں، امام اشعری فلسفہ سے کہاں تک واقف تھے یہ ہمارے مقالہ کا موضوع ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ آغاز ہی سے متکلمین نے فلسفہ کے تنقیدی مطالعہ کو اپنا



شعار بنایا، یہی انداز چوتھی صدی ہجری میں بھی رہا، چنانچہ امام ابو الحسن الاشعری کے معاصر ابو ہاشم
جبائی (جو ان کے استاد ابو علی جبائی کے بیٹے ہیں) نے بھی فلسفہ کے رد میں متعدد کتابیں
لکھیں، ان میں سے چند کے نام ابن ندیم نے الفہرست میں لکھے ہیں، مثلاً "کتاب النقض
علی ارسطاطالیس فی الکون والفساد"[1]، "کتاب الطبائع والنقض علی القائلین بہا"[2]۔ چوتھی
صدی کے نصف آخر میں قاضی ابو بکر الباقلانی اٹھے، وہ امام ابو الحسن الاشعری کے شاگرد
ابن مجاہد الطائی اور ابو الحسن الباہلی کے شاگرد تھے، ان کے تبحر فی الفلسفہ کا تذکرہ ہم آگے
کریں گے، پانچویں صدی میں امام غزالی اور چھٹی صدی میں امام رازی نے اشاعرہ کے علم کلام کو
ترقی دی، ان دونوں بزرگوں کی فلسفہ دانی اظہر من الشمس ہے۔

غرض اساطین اشاعرہ خواہ وہ متقدمین ہوں یا متاخرین، علوم فلسفہ میں ید طولیٰ
رکھتے تھے، اور ان کی فلسفہ دانی کسی طرح فلاسفۂ اسلام کی فلسفہ دانی سے کم نہ تھی، صرف یہ
فرق ہے کہ حکمائے اسلام افلاطون اور ارسطو کے معصوم عن الخطا ہونے پر ایمان رکھتے تھے، اور
متکلمین انھیں انسان سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے ان کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا،

اس لیے درحقیقت کلام نام ہی ہے فلسفۂ یونان اور دیگر فلسفی نظاموں کے تنقیدی مطالعہ
کا، چنانچہ فلسفیانہ مسائل میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے، جس کے متعلق متکلمین کا ایک مستقل موقف
نہ ہو اور ان کا یہ انداز کتب کلامیہ ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کا عام انداز بحث یہی ہے،
مثال کے طور پر شرح عقائد نسفی کو لیجیے، اس میں ایمان بالرسالۃ اور ایمان بالآخرہ کی بحثیں
بہت بعد میں آئی ہیں، خصوصاً خاص کلامی بحثیں بہت ہی بعد میں مذکور ہوئی ہیں، پہلی بحث
جس سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے "صحت علم" (Validity of Knowledge) کی ہے،

[1] ارسطو کی کتاب الکون والفساد کی تردید [2] مادہ پرستی کی توضیح اور مادہ پرستوں کے رد میں۔

اس بحث کی اصل صراحۃً تو کتاب وسنت میں نہ ملے گی، کیونکہ یہ کوئی عقائد کا مسئلہ نہیں، بلکہ خالص فلسفیانہ مسئلہ ہے، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں "علمیات" (Epistemology) کے متعلق متکلمین اسلام کے موقف کو متعین کرتا ہے، اور یہ موقف وہی اختیار کر سکتا ہے جس نے نظریۂ علم کے باب میں متقدمین ومتاخرین فلاسفہ کے مذاہب اور ان کے دلائل کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا ہو، خصوصاً سقراط کے پیشرو سوفسطائیہ کے مسالک ودلائل کا اور ارسطاطالیسی متشککین (Sceptics) مثلاً پرہو، کارنیاڈیز، اسپیڈیموس اور اگرپا کے نظریات وافکار کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا ہو، اس وسعت مطالعہ کے بعد ایک متکلم لکھ سکتا ہے:

| | |
|---|---|
| قال اهل الحق حقائق الاشیاء | اہل حق نے کہا ہے کہ حقائق اشیا ثابت ہیں |
| ثابتة والعلم بها متحقق خلافاً | اور ان کا علم حاصل ہو سکتا ہے، برخلاف |
| للسوفسطائية[1] | سوفسطائیہ کے۔ |

جس نے سوفسطائی فلاسفہ کے گھر کا بھید ہی نہ جانا ہو، وہ بھلا کس طرح ان کے گھر کو ڈھا سکتا تھا؟

شرح عقائد نسفی ایک مختصر کتاب ہے، شرح مواقف کو دیکھئے الوہیت اور نبوت (Theology) سے متعلقہ مسائل پانچویں اور چھٹے موقفوں میں بیان ہوئے ہیں، پہلے چار مواقف میں خالص فلسفیانہ مسائل ہی کا نقد ورد ہے، ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جرأت وہی کر سکتا ہے جو معقولات وفلسفہ کے گھر کا بھیدی ہو، چنانچہ موقف اول کے مرصد رابع میں علوم ضروریہ کے اثبات کے سلسلہ میں منکرین حسیات اور منکرین بدیہیات کے جو دلائل نقل کیے ہیں ان سے زیادہ قوی دلائل ہیوم، کانٹ، کومٹے اور دوسرے متشککین عہد جدید بھی تحریر نہیں کر سکے، پھر جس معقول انداز میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے اس سے بہتر طریقہ سے عہد حاضر کے فلاسفہ بھی اس مسئلے کو حل نہیں کر سکے۔ یہی حال دوسرے مواقف ومراصد کا ہے۔ اور یہی علم کلام کے محتویات



(Contents) ہیں۔

کیا اس تفصیل وتوضیح کے بعد بھی اشاعرہ یا انکے پیشرو متکلمین کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ "یہ لوگ متکلمین کے علوم سے تو واقف تھے لیکن معقولات کے گھر کے بھیدی نہ تھے"

لیکن اگر کوئی شخص سخن پروری میں کہے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے، مگر "امام ابو الحسن الاشعری اور انکے متبعین کے زمانے میں لوگ بغیر معقولات کے گھر کا بھیدی ہوئے متکلمین کے علوم سے واقف ہوجایا کرتے تھے" تو جواب میں عرض ہے کہ ممکن ہے اس زمانے میں ایسے عجوبۂ روزگار لوگ موجود رہے ہوں جو معقولات کے گھر کا بھیدی ہوئے بغیر متکلمین کے علوم سے واقف ہو جاتے ہوں، لیکن کم از کم امام ابو الحسن الاشعری اور ان کے متبعین ان لوگوں میں نہیں تھے، وہ اگر ایک طرف متکلمین کے علوم سے واقف تھے تو دوسری طرف معقولات کے گھر کے بھیدی بھی تھے۔ امام اشعری کے سوانح اور ان کے متبعین کے تذکروں سے اسکی تصدیق ہو سکتی ہے۔

ابن عساکر دمشقی (المتوفی ۵۷۱ھ) نے "تبیین کذب المفتری" میں آٹھ صفحوں میں امام ابو الحسن اشعری کی تصانیف کے صرف نام گنائے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر کتابیں فلسفہ کے رد میں ہیں، اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام صاحب نہ صرف علوم کلامیہ ہی میں تبحر رکھتے تھے، بلکہ صحیح معنوں میں معقولات کے گھر کے بھیدی تھے، مختلف فلسفیانہ مباحث پر امام صاحب کی تصنیفات ملاحظہ ہوں[1]:

(۱) علمیاتی مسائل (Dialectics)

(۱) ادب الجدل:۔ الفنا کتاباً سمیناہ ادب الجدل

یہ کتاب اس موضوع پر ہے، جسے آجکل (Dialectics) کہا جاتا ہے۔

(۲) شرح ادب الجدل:۔ الفنا کتاباً فی شرح ادب الجدل

یہ (Dialectics) پر امام صاحب کی کتاب کی شرح ہے۔

[1] یہ خود امام ابو الحسن کی تحریر کی نقل ہے۔

(۳) الفنا کتابا اجبنا فیہ عن مسائل الجبائی فی النظر والاستدلال وشرائطہ

نظر اور استدلال اور ان کے شرائط کے متعلق یہ کتاب جبائی کے مسائل کا جواب ہے، (نظر اور استدلال کی توضیح کے لیے دیکھیے شرح مواقف موقف کا پانچواں چھٹا مرصد)

(۴) الفنا کتابا فی الاستشہاد اوریا فیہ کیف یلزم المعتزلۃ علی مجتہم فی الاستشہاد بالشاہد علی الغائب ان یثبتوا علم اللہ وقدرتہ وسائر صفاتہ

اس کتاب کا موضوع وہ طریق استدلال ہے جسے "قیاس الغائب علی الشاہد" کہتے تھے، معتزلہ اور دوسرے فرقے اس استدلال میں مدد لیا کرتے تھے لیکن اشاعرہ اس کی افادیت کلیہ کے قائل نہیں ہیں، وہ اسے استدلال کا ضعیف طریقہ سمجھتے ہیں، امام صاحب نے اس کتاب میں اشاعرہ کے موقف کی تائید کی ہے اور معتزلہ پر الزامی دلیل قائم کی ہے کہ اس طریق استدلال کی صحت کلیہ (Universal Validity) کی حالت میں انھیں اللہ تعالیٰ کی صفات کو ماننا پڑیگا حالانکہ معتزلہ اس کے منکر تھے۔ قیاس الغائب علی الشاہد کی تنقید کے لیے دیکھیے شرح المواقف اول مرصد ششم مقصد پنجم

(۵) کتاب علی اہل المنطق

منطق اگرچہ فلسفہ کا ایک جزء ہے، مگر منطقیوں کا ایک مستقل مسلک بن گیا تھا، جو دوسرے فرقوں کی طرح اسلام پر اعتراض کیا کرتے تھے، امام صاحب نے اس کتاب میں منطقیوں کے مسلک کو رد کیا ہے،

(۶) الکتاب الاول من کتاب الفصول: اثبات النظر وحجۃ العقل والرد علی من انکر ذالک،

یہ امام صاحب کی ایک مبسوط کتاب کا پہلا جزء ہے جس میں انھوں نے نظر کا اثبات کیا ہے اور عقل کی حجیت پر دلیل قائم کی ہے، اور جو فرقے نظر کی افادیت مطلقہ یا افادیت جزئیہ کے منکر ہیں



ان کا رد کیا ہے (اس مبحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے شرح المواقف موقف اول مرصد پنجم مقصد سوم)

متشککین (Seeptics) اور سوفسطائیہ (saphists) کے فرقے امام صاحب کے زمانے میں بھی تھے اور انھوں نے موثر طور پر ان کا رد کیا ہے۔

ب۔ وجودیاتی مسائل (Ontology)

(۷) الفنا کتابا فی باب شئ وان الاشیاء ہی اشیاء وان عدمت"

یہ امام صاحب کے زمانۂ اعتزال کی تصنیف ہے اور اس کا موضوع فلاسفہ ومعتزلہ کی ایک دلچسپ حماقت ہے کہ "شئ موجود ہونے سے قبل بھی شئ ہوتی ہے"، اور اسی کے قریب یہ مسئلہ ہے کہ وجود ماہیت پر زائد ہوتا ہے اور یہ ماہیت وجود سے خالی (معری) ہو سکتی ہے جس پر انکی بہت سی گمراہیوں کی بنیاد قائم ہے۔ امام صاحب نے بھی دیگر معتزلہ کی طرح اس مسئلے پر قلم فرسائی کی ہے، مگر اعتزال سے تائب ہوجانے کے بعد خود اسکی تردید کی، چنانچہ کتاب العمد میں کہتے ہیں،

(۸) رجعنا عنہ ونقضناہ

اس مسئلے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے المحصل للرازی ص ۳۷-۳۸)

ج۔ کونیاتی مسائل (Cosalagy)

(۹) کتاب فی الرد فی الحرکات علی ابی الہذیل

ابو الہذیل العلاف اس بات کا قائل تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کی حرکات ختم ہوجائیں گی، امام صاحب نے اس کتاب میں اس حماقت کا رد کیا ہے۔

د۔ ملاحدہ کی تردید

(۱۰) جمل المقالات: الفنا کتابا فی جمل مقالات الملحدین وجمل اقاویل الموحدین سمیناہ جمل المقالات،

امام صاحب نے اس کتاب میں بیدین ملاحدہ اور اہل مذہب موحدین کے اقوال وعقائد

قلمبند کیے ہیں۔ اس طرح یہ مختلف مذہبی معتقدات کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

(۱۱) کتاب لفنون فی الرد علی الملحدین

اس کتاب میں امام صاحب نے ملاحدہ بے دین کا رد کیا ہے۔

(۱۲) کتاب المسائل علی اہل التثنیہ

یہ کتاب ان لوگوں کے رد میں ہے جن کا تصور یہ تھا کہ عالم دو اصلوں سے ظہور میں آیا، ایک نور جو خیر محض ہے اور دوسرے ظلمت جو شر محض ہے۔

ک۔ دہریین (Athiests.) کی تردید

۱۳۔ الفنا کتابا مجردا ذکرنا فیہ جمیع اعتراض الدھریین فی قول الموحدین ان للحوادث اولا وانہا لاتصح الا من محدث وفی ان المحدث واحد واجبنا عنہ بما فیہ اقناع للمسترشدین، وذکرنا ایضا اعتلالات لہم فی قدم الاجسام۔ وہذا الکتاب غیر کتبنا التی ذکرناہا فی صدر کتابنا ہذا (یعنی العمدہ) وہو مرسوم بالاستقصاء لجمیع اعتراض الدہریین وسائر اصناف الملحدین

خدا پرست موحدین کہتے ہیں کہ حوادث کائنات کا ایک آغاز ہے اور حوادث بغیر ایک محدث (خدائے تعالیٰ) کے وجود میں نہیں آسکتے، نیز وہ محدث (صانع عالم) ایک ہے۔ اہل توحید کے اس مسلک پر دہریین گوناگوں اعتراضات کرتے تھے۔ امام صاحب نے اس کتاب میں ان تمام اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے، اس کے علاوہ دہریوں نے قدم اجسام پر جو دلائل قائم کیے ہیں ان کا بھی اس کتاب میں ذکر کیا ہے، غرض اس کتاب میں ملاحدہ و دہریوں کے تمام اعتراض موجود ہیں۔

(۱۴) الفنا کتابا علی الدہریین فی اعتلالاتہم فی قدم الاجسام بانہا لاتخلو ان لوکانت محدثۃ من ان یکون احدثہا لنفسہ اولعلۃ

دہریہ قدم اجسام کے ثبوت میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر اجسام قدیم نہیں بلکہ حادث ہیں، تو



دو حال سے خالی نہ ہوں گے، یا تو اپنی ذات کی وجہ سے انھیں پیدا کیا ہوگا یا کسی اور علت کی وجہ سے، امام اشعری نے ان کی اس دلیل کا اس کتاب میں جواب دیا ہے،

(۱۵) نقض کتاب التاج علی ابن الراوندی۔

ابن الراوندی اس زمانے کا بہت مشہور دہریہ تھا، اور اس کی کتاب "التاج" دہریت کی گویا انجیل تھی، امام صاحب نے اس کتاب کا رد اپنی کتاب میں کیا ہے۔

و۔ مادہ پرستوں (Materialists) یا اہل الطبائع کی تردید

(۱۶) الفنا کتابا اخبرنا فیہ عن اعتلال من زعم ان الموات تفعل بطبعہ ونقضنا علیہم اعتلالاتہم واوضحنا غوہم

دہریوں کے علاوہ ایک اور فرقہ مادہ پرستوں کا تھا جس کا خیال یہ تھا کہ بیجان مادہ اپنی طبیعت کی بنا پر دنیا میں خود سب کچھ کرتا ہے، اور اس پر دلیل قائم کرتے تھے، امام صاحب نے اس تصنیف میں ان کا رد کیا ہے،

ز۔ فلاسفہ کے اقوال کی دائرۃ المعارف (Encyclopaedia)

(۱۷) کتابا فی مقالات الفلاسفۃ خاصۃ

اس کتاب میں امام صاحب نے مختلف مکاتب خیال کے فلاسفہ کے اقوال درج کیے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ کے مختلف مسالک سے تفصیلی طور پر واقف تھے،

ح۔ فلاسفہ کی تردید

(۱۸) الفصول: صنفت کتابا سماہ الفصول فی الرد علی الملحدین والخارجین عن الملۃ کالفلاسفۃ والطبائعیین والدہریین واہل التشبیہ والقائلین بقدم الدہر علی اختلاف مقالاتہم وانواع مذاہبہم، ثم رد فیہ علی البراہمۃ والیہود والنصاری والمجوس، وہو کتاب کبیر یشتمل علی اثنی عشر کتابا: اول کتا

اثبات النظر وحجة العقل والرد علی من انکر ذالک، ثم ذکر علل الملحدین والدہریین مما احتجوا بہا فی قدم العالم وتکلم علیہا واستوفی ما ذکرہ ابن الراوندی فی کتابہ المعروف بکتاب التاج وھو الذی نصر فیہ القول بقدم العالم۔

اس کتاب میں تمام غیر مسلم فرقوں کا جیسے فلاسفہ، مادہ پرست، دہریے، اہل التشبیہ وغیرہ کا رد ہے، پھر براہمہ، یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کا رد ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد جو ( Dialectics ) پر ہے اس کا ذکر نمبر ۵ کے تحت میں اوپر ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ملاحدہ و دہریین جو قدم عالم پر دلیلیں قائم کرتے تھے، ان کی تفصیل اور ان کا مکمل رد ہے، نیز ابن راوندی نے کتاب التاج میں قدم عالم کے جو دلائل بیان کیے ہیں انھیں بالاستقصاء بیان کیا ہے۔ اس سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام صاحب کو فلسفہ میں کتنا تبحر حاصل تھا، اور وہ معقولات کے گھر کے بھیدی تھے یا نہیں۔

(۱۹) الفنا کتابا فی الرد علی الفلاسفة یشتمل علی ثلاث مقالات، ذکرنا فیہ نقض علل ابن قیس الدہری، وتکلمنا فیہ علی القائلین بالہیولی والطبائع ونقضنا فیہ علل ارسطوطالیس فی السماء والعالم وبینا غلطہم فی قولہم باضافة الاحداث الی النجوم وتعلیق احکام السعادة والشقاوة بہا،

اس کتاب میں فلسفیوں اور ابن قیس الدہری کا جو راوندی کے بعد اس زمانہ کا سب سے بڑا دہریہ ہے، ہیولیٰ کے قائلین اور مادہ پرستوں (اہل الطبائع) کا رد ہے، نیز ارسطو نے اپنی کتاب "السماء والعالم" میں جو کچھ کہا ہے اس کا رد ہے، پھر منجموں کا جو حوادث کو نجوم کے اثرات کا نتیجہ بتاتے ہیں اور نیک بختی اور بدبختی کو ستاروں کی رفتار سے متعلق کرتے ہیں، اس کا رد ہے، اس سے بھی امام اشعری کے تبحر فی الفلسفہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

ط۔ خصوصیت سے ارسطوطالیس کی تردید،



(۱۹) کتاب بالا (نمبر ۱۷) کا وہ حصہ جس میں ارسطاطالیس کی کتاب السماء والعالم کا رد کیا ہے۔

(۲۰) نقض کتاب الآثار العلویہ علی ارسطاطالیس

ان دونوں کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوالحسن الاشعری نہ صرف اپنے عہد کے فلاسفہ (نام نہاد حکمائے اسلام) ہی کے مذاہب فکر و تعلیمات سے واقف تھے، بلکہ انھوں نے یونان کے قدیم فلاسفہ کا بھی تفصیلی طور پر مطالعہ کیا تھا، اور ارسطو کی ایک ایک کتاب سے واقف تھے،

ہم نے مذکورۂ بالا فہرست میں صرف ان ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو صراحۃً فلسفہ و معقولات کی توضیح و تبیین اور تنقید و تردید میں ہیں، غالباً ان تصریحات کے بعد کسی کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ امام ابوالحسن الاشعری فلسفۂ یونان سے واقف نہ تھے، یا معقولات کے گھر کے بھیدی نہ تھے،

امام اشعری کے متبعین کے علمی کارناموں کی تفصیل موجب تطویل ہوگی، اس لیے مختصراً صرف ان کے شاگرد ابن مجاہد الطائی اور ابوالحسن الباہلی کے شاگرد قاضی ابوبکر الباقلانی (المتوفی ۴۰۳ھ) کی کتاب التمہید کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا، رد الحاد کے سلسلے میں قاضی ابوبکر الباقلانی کی خدمات کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بتلا دینا کافی ہے کہ انھوں نے ملاحدہ کے رد میں ستر ہزار اوراق لکھے تھے، چنانچہ ان کے جنازے کے آگے منادی یہ اعلان کرتا جاتا تھا:

| | |
|---|---|
| هذا ناصر السنة والدين، هذا | یہ سنت اور دین کے مددگار ہیں، یہ مسلمانوں |
| امام المسلمین، هذا الذي كان | کے امام ہیں، یہ وہ ہیں جو مخالفین دین کے |
| یذبُّ عن الشریعة السنة المخالفین | حملوں سے شریعت کی حمایت کیا کرتے تھے |
| هذا الذي صنف سبعین الف | یہ وہی ہیں جنھوں نے ملاحدہ کے رد میں ستر ہزار |
| ورقة رداً علی الملحدین | اوراق تصنیف فرمائے۔ |

انھیں عضد الدولہ پناہ خسرو بادشاہ شیراز نے بغداد سے بلا بھیجا، قاضی صاحب نے عضد الدولہ

کے قاضی القضاۃ کو بر سر دربار عام مناظرے میں شکست دی، بادشاہ قاضی صاحب کی جلالتِ علم سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے شہزادے کو قاضی صاحب کے سپرد کردیا کہ اسے اپنے طور پر تعلیم دیں۔

قاضی صاحب نے اسی شہزادے کے واسطے کتاب التمہید تصنیف کی، یہ ان کی کوئی بڑی تصنیف نہیں ہے، صرف مبتدیوں کے لیے ہے تاہم اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام باقلانی نہ صرف مختلف اسلامی فرقوں کے مذاہب ہی سے واقف تھے، بلکہ غیر اسلامی فرقوں کے مسالک میں بھی بصیرت تامہ رکھتے تھے، بالخصوص فلسفہ کے مختلف مذاہب فکر یعنی دہریین، اہل الطبائع اور منجمین کے اقوال اور ان کے دلائل و استدلالات سے پوری طرح واقف تھے اور اسی کے ساتھ ان کی کمزوریوں پر بھی مطلع تھے، چنانچہ مطبوعہ التمہید کے صفحہ ۴۰ سے صفحہ ۵۲ تک وہ دہریہ فرقے کا رد کرکے صانع عالم کے وجود کو ثابت کرتے ہیں، صفحہ ۵۲ سے صفحہ ۶۱ تک اہل الطبائع اور دہ پرستوں کا، صفحہ ۶۱ سے صفحہ ۶۰ تک منجمین کا اور صفحہ ۶۰ سے صفحہ ۷۴ تک ثنویوں کا رد ہے۔

مگر آجکل کے مدعیانِ تحقیق فرماتے ہیں کہ یہ گروہ متکلمین کے علوم سے تو واقف تھا مگر معقولات کے گھر کا بھیدی نہ تھا، اس لیے وہ اس عام بے اعتقادی کی رفتار کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ انتہائی ظلم ہے جو محققین نے فی سبیل اللہ کام کرنے والوں کے حق میں روا رکھا ہے، اشاعرہ نے عام بے اعتقادی کی بڑھتی ہوئی رو کو بدلنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی، اس کے متعلق بھی حافظ ابن عساکر کی رائے سنیے جو انھوں نے آج سے آٹھ سو سال پیشتر دی تھی:

قال الامام الحافظ رضی اللہ عنہ: فکانت هذه صفة الشیخ ابی الحسن رضی اللہ عنہ عند ظهور البدع ووقوع الفتن فعلم الناس

امام حافظ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: بدعتوں کے ظہور اور فتنوں کے وقوع کے وقت شیخ ابی الحسن الاشعری رضی اللہ عنہ کی یہ کیفیت تھی، پس آپ نے لوگوں کو ان کے دین کے معنی بتائے اور ان کے یقین کی تقویت



معانی دینهم واوضح الحجج لتقویة یقینهم وامرهم بالمعروف فیما یجب اعتقاده من تنزیه اللہ تعالیٰ عن مشابهة مخلوقاته وبین لهم ما یجوز اطلاقه علیه عزوجل من اسمائه الحسنیٰ و صفاته ونهاهم عن المنکرین تشبیه صفاته بصفات المحدثین وذواته بذواتهم، فکانت طاعته فیما امر به من التوحید مقربة للمقتدی به الی مرضاته لانه کان فی عصره اعلم الخلق بما یجوز ان یطلق فی وصف الحق فاظهر فی مصنفاته ما کان عنده من علمه فهدی اللہ به من وفقه من خلقه لفهمه

کے لیے حجتوں کو واضح کیا اور انھیں معروف کا حکم دیا کہ مشابہت مخلوقات سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کے لیے کن باتوں کا اعتقاد رکھنا چاہیے اور انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفات میں سے کس کس کا اطلاق اس پر جائز ہے اور انھیں منکر سے منع کیا کہ محدثات کی صفات و ذوات سے اللہ تعالیٰ کی صفات و ذات کو مشابہ قرار دیں، پس امام اشعری کی پیروی اس معاملے میں جس میں وہ توحید کا حکم دیتے تھے، ان کے پیروؤں کے لیے اللہ کی رضامندی کی قریب کرنے والی ہے کیونکہ وہ اپنے زمانے میں اس معاملے میں سب سے بڑے عالم تھے کہ حق سبحانہ تعالیٰ پر کس چیز کا اطلاق جائز ہے، پس انھوں نے اپنی تصانیف میں جو کچھ انھیں علم تھا ظاہر کردیا، پس اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے جسے اس کے سمجھنے کی توفیق دی، اس علم سے اسے ہدایت بخشی۔

امام ابوالحسن الاشعری اور ان کے متبعین نے الحاد و دہریت کی بڑھتی ہوئی رو کو جس حد تک روکا اس کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ امام اشعری کے نفس گرم کی تاثیر سے مشرق و مغرب میں ہزاروں مصلحین پیدا ہوگئے جنکے اسماء گرامی حافظ ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری کے تقریباً ۵۰ صفحوں میں دیے ہیں اور پھر بھی انھیں عدم استقصاء کا شکوہ ہے اور فرماتے ہیں: "ومن لم اذکرهم منهم اکثر ممن ذکرت"۔ غرض یہ امام صاحب ہی کا فیض ہے کہ آج کے دن تک اہل اسلام فلاسفہ کے ہفوات و اباطیل کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔

# اقبال سہیل میری نظر میں

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے، ال ال بی وکیل

(۲)

سہیل نے اگرچہ بہت کافی غزلیں لکھی ہیں، جو محاسن شعری کے لحاظ سے نظرانداز نہیں کی جاسکتیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو غزل گوئی سے بہت کم دلچسپی تھی، اور اس کے وہ خود بھی معترف تھے، وہ غزل کو ایک معمولی صنف شاعری سمجھتے تھے، اگرچہ مجھکو ان کی اس رائے سے ہمیشہ اختلاف رہا، لیکن ان کا یہ خیال ایک حیثیت سے کچھ غلط بھی نہ تھا، وہ اپنی قوتِ تخئیل کی وسعت سے مجبور تھے، ان کے دماغ سے خیالات کا جو طوفان اٹھتا تھا، وہ تنگنائے غزل میں کہاں سما سکتا تھا، اس کے لیے تو بہت کچھ کھلی ہوئی فضا درکار تھی، جو قصائد ہی کے میدان میں نصیب ہو سکتی تھی،

ممکن ہو کہ ان کی غزلوں میں کسی شوریدہ مزاج کے پرگداز عاشقانہ جذبات کی شرر باریاں نظر آئیں، لیکن ہم کو مسرت ہے کہ وہ اس میکدے میں ایک رسوائے سربازار کی مبتذل اداؤں کے ساتھ نہیں، بلکہ ایک بلند حوصلہ اور عالی نظر رند کی حیثیت سے داخل ہوئے ہیں، جس کا ہر قدم عزتِ نفس اور خودداری کے احساس کے ساتھ اٹھتا ہے، جو بندگی کی لعنت کے ہوتے ہوئے زندگی کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتا، جس کو خود اپنے دست و بازو کا تعمیر کردہ نشیمن دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہے، جس کی غیرتِ عشق کسی حال میں حسن سے سوال کرم پر آمادہ نہیں ہوتی جس کے ذوقِ جستجو کی ہمت منزل کو ہر قدم پہ گریزاں بنا دیتی ہے، جس کی موج زندگی کو شورش عمل کے لیے



ہمیشہ پرخطر راہوں کی تلاش رہتی ہے، جس کا غمکدۂ حیات جہانِ غیر کے مہر و ماہ سے نہیں، بلکہ خود اپنے ہی داغِ دل سوزِ دل کی تراوشِ نور سے جگمگا رہتا ہے۔

غرض سہیل کی غزلیہ شاعری میں اور کچھ نہ ہو لیکن یہ کیا کم ہے کہ اس کے ترانہائے سخن سے ہمارے دل و دماغ کی اخلاقی سطح دفعۃً بلند ہو جاتی ہے، اور ہم ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں گدایانہ عجز و ابتذال کا کوئی منظر نظر نہیں آتا، سہیل نے غزل کے پردے میں جن بلند خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے، ان کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے، جو ان کی مختلف غزلوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔

رتبہ داں تھا جبینِ عشق کا میں    حسن کے در پہ جبہ سا نہ ہوا
ننگ ہے بے عمل قبول بہشت    یہ تو صدقہ ہوا صلہ نہ ہوا
عشق اور حسن سے سوال کرم    یہ تو غیرت کا اقتضا نہ ہوا

پھر موج زندگی میں نہیں شورشِ عمل    پھر کوئی سنگِ راہ مقابل نہیں رہا
گم تھی فضائے عشق میں کل کائنات حسن    اٹھا غبار قیس تو محمل نہیں رہا

غلامی میں وفا بے سود، سجدہ رائگاں میرا    نہ خود میری جبیں میری نہ ان کا آستاں میرا
ان ہی ذروں سے کل دنیا نئی تعمیر کرتی ہے    سنبھال اے دامنِ فطرت غبارِ ناتواں میرا

بلائے جاں جو نہ ہوتی کشاکشِ ہستی    سکون عیش میں جینا بلائے جان ہوتا
یہ کیا کہ شمع سے شعلہ طلب ہے پروانہ    خود اپنے سوز دروں سے شرر فشاں ہوتا

اٹھی تھی بحر حسن سے اک موج بیقرار    فطرت نے اسکو پیکر انساں بنا دیا
اے سوز ناتمام کہاں جائے آب خلیل    آتشکدے کو بھی تو گلستاں بنا دیا
اے ذوقِ جستجو تری ہمت پہ آفریں    منزل کو ہر قدم پہ گریزاں بنا دیا

تنگ ہے صید زبوں ہمت عالی کیلیے — میری مشکل ہے مرے کام کا آساں ہونا

پہلے پیدا تو کر آتشکدۂ شوق خلیل — آج بھی سہل ہے شعلوں کا گلستاں ہونا

---

وارفتگان عشق کو سمجھا ہے تو نے کیا — ان میکشوں میں ہوتے ہیں یزداں شکار تک

---

میری سجود شوق سے ہو جائے بے نیاز — اتنا بلند حوصلۂ سنگ در نہیں

---

قید غلامی و حیات ننگ سے ننگ کائنات — لعنت بندگی کے ساتھ صورت زندگی نہ دیکھ

---

چلنا سنبھل کے وادیٔ الفت میں ہر قدم — یاں ہر قدم پہ لغزش مستانہ چاہیے

آخر کلیم سنتی پڑیں لن ترانیاں — اب بھی کہو کہ عجز گدایانہ چاہیے

---

ہر ایک ساز سے سنتا ہوں اپنی ہی آواز — فضا میں گونج رہی ہے فقط صدا میری

---

مذاق سربلندی ہو، تو پھر دیر و حرم کیسے — جبیں سائی کی فطرت نے کیے ہیں سنگ در پیدا

اس شعر پر ندرت خیال کے لحاظ سے سہیل کو خود ناز تھا اور بجا ناز تھا، افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے ہم کو ان ہی چند اشعار پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، ورنہ تقریباً ان کی ہر غزل اسی قسم کے جذبات سے لبریز ہے، سیاسی حالات کی طرف بھی انھوں نے اکثر اشارے کیے ہیں اور یہ ان کا ایک خاص انداز تھا، لیکن انداز بیان کی شعریت میں کوئی فرق آنے نہیں پایا ہے، مثال کے طور پر ہم ان کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتے ہیں، ناظرین غور کریں کہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس طرح کہہ رہے ہیں حصول آزادی کے بعد ابنائے وطن کی جس پستی فطرت کا ظہور ہوا تھا، اسی کی یہ تصویر ہے، ملاحظہ ہو،

ہماری پستی فطرت نہ تھی یوں آشکار ابتک — کہ تھی دیوار زنداں راز دل کی پردہ دار ابتک

گیا ساقی تو کیا بے خود ہیں اسکے جرعہ خوار ابتک — سروں میں ہے اسی صہبائے دیریں کا خمار ابتک

وہی شام و سحر ابتک وہی لیل و نہار ابتک — خدا جانے کہاں ہے انقلاب روزگار ابتک

شب غم کاٹ دی تھی جسکی یاں پردۂ تصور میں — چھپی ہے کہر کی تہ میں وہ صبح زرنگار ابتک



فضائے جاں ابھی مسموم ہے یاد شب غم سے — دیار دل ہے خون آرزو سے لالہ زار ابتک

بہا ڈالے ہزاروں خانماں سیل حوادث نے — دلوں میں یہ تپش ہے پھر بھی صدیوں کا غبار ابتک

چھپائے سے کہیں چھپتا ہے داغ معصیت کوشی — ہے دامان صبا آلودۂ خون بہار ابتک

مری سادہ دلی تھی یا جنون یہ سب بجا لیکن — میں سمجھا تھا ترے عہد وفا کو استوار ابتک

قفس کے تنگنائے تیرہ میں عمریں بسر کی ہیں — نشیمن کی فضا ہم کو نہیں ہے سازگار ابتک

شاعرانہ پیرایۂ بیان کا یہی کمال ہے کہ شاعر جو کچھ چاہے کہے، خواہ اس کا تعلق فلسفہ سے ہو یا اخلاق سے، مذہب سے ہو یا سیاست سے، لیکن وہ ہر موقع پر شاعر ہی رہے خشک مزاج فلسفی یا ملائے مسجدی نظر نہ آئے، ورنہ اس کی تمام سعی قلم بے اثر ہو کر رہ جائے گی، غزل کے لہجہ میں شاعر نے دکھتی ہوئی رگوں پر جس موثر انداز سے چوٹیں لگائی ہیں، وہ کسی واعظ تلخ نوا کی زبان کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا.

علاوہ حقائق و اسرار کے سہیل کے خامۂ جادو نگار نے واقعہ نگاری اور مناظر قدرت کی مصوری کے بھی نمونے چھوڑے ہیں، جن سے ان کی قادر الکلامی کا مزید ثبوت ملتا ہے، مثلاً کوہ مسوری کا دلفریب منظر نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں

مرحبا کوہ مسوری یہ تری شان جمال — تیری چوکھٹ چومتے ہیں سر فروشان جمال

جا بجا خمدار سڑکیں اس پہ پھولوں کا ہجوم — جیسے بل کھائی ہوئی زلف عروسان جمال

تیری برف آلود چوٹی بن گئی آئینہ دار — دیکھنی چاہی شعاع خور نے جب شان جمال

تیرے کھنڈے ابر یوں لہرا کے ہوتا ہے بلند — رقص میں ہو جیسے آہ مستمندان جمال

صبحدم وہ شعلۂ رخسار گل کی آب و تاب — جگمگا اٹھی ہے گویا اک شبستان جمال

شب کو وہ فانوس برقی کی فروغ انگیزیاں — ہر طرف روشن ہے اک سرو چراغان جمال

طبیعت کی افتاد بھی عجیب چیز ہوتی ہے! دیکھیے یہ نشاط انگیز منظر ان کے قلم کا رخ کس طرف پھیر

دیتا ہے، چنانچہ دوسرے بند میں جوش میں آکر کہتے ہیں ،

گوش عبرت ہو تو سن مرغانِ صحرا کی صدا
زندگی مرغ قفس کی ہے عذاب زندگی

اے اسیر رنگ و بو تا کے گرفتار فریب
اٹھ کہ اب آیا ہے وقتِ احتساب زندگی

دہر کو مسحور کر دے نغمۂ توحید سے
چھیڑ دے ناخن سے پھر تار ربابِ زندگی

جا سوئے گور غریباں گر ہے راحت کی تلاش
زندگی تو اصل میں ہے اضطرابِ زندگی

حریت و آزادی کا یہی وہ مقدس جذبہ ہے جو سہیل کے دل و دماغ پر ہمیشہ مستولی رہا، اور جس کے اعلان سے ان کی زبان قلم کبھی آسودہ نہ ہو سکی۔

اب وقت آگیا ہے کہ میں نے اب تک جو سپرد قلم کیا ہے، اس کی بنا پر ناظرین فیصلہ کریں کہ عام شعراء کی طرح محض چند فرسودہ مضامین کو نئے الفاظ کا جامہ پہنا کر سہیل دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، یا انھوں نے ہر قسم کی قومی وسیاسی، اخلاقی، تاریخی اور مذہبی نظمیں لکھ کر اردو ادب میں ایسا اضافہ کیا تھا، جس کو جان ادب کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا ،

میں نہیں کہتا کہ سہیل کا یہ سحر طراز قلم آیندہ کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا، قدرت اپنی فیاضیوں میں کمی نہیں کرتی، اس کے دریائے کرم سے گہر ریز موجیں اٹھا کرتی ہیں، لیکن فضا ناموافق ہوتی ہے تو اکثر ان موجوں کا جوش و خروش دب کر رہ جاتا ہے، اس وقت بھی اسی قسم کی ایک غبار آلود اور مسموم فضا ہماری نگاہوں کے سامنے ہے جس میں آیندہ کسی جوہر قابل کے چمکنے کی صورت نظر نہیں آتی، یاران وطن کا جوش انتقام اردو ادب کے پیکر معصوم پر جس بے دردی کے ساتھ تیر اندازی کر رہا ہے، اس کو دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں کہ انسان کس حد تک کم نظر اور تنگ دل ہو سکتا ہے !

سلسلۂ سخن میں اس وقت قلم کا رخ جس طرف ہو گیا ہے، وہ کچھ دیر اور قائم رہا تو ممکن ہے کہ طبیعت بدمزہ ہو جائے، اس لیے اب سہیل کا قند پارسی پیش کرتا ہوں جس سے ناظرین کے



کام و دہن کو بہت کچھ لذت حاصل ہو سکتی ہے،

ہندوستان نے اکثر فارسی شعرا پیدا کیے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، جن کے ذوق فارسیت پر اہل زبان بھی من حیث الفن خردہ گیری نہ کر سکیں، قدما میں یہ درجہ صرف خسرو اور فیضی کو حاصل تھا، جن کے کمال فن کا اعتراف اہل ایران کو بھی کرنا پڑا، دور ما بعد میں بھی یہ فخر ہندوستان کو حاصل رہا ہے، کلام کا خالص ایرانی رنگ دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ غالب، نیر، علامہ شبلی، مولانا حمید الدین ہندی نژاد تھے! ان نادر روزگار بزرگوں کے بعد اگر کسی اور پر نظر پڑتی ہے، تو وہ یہی استاذ شبلی کا خاک بوس سہیل ہے، جس کی نواسنجیوں نے ایک دفعہ پھر عرفی و نظیری کی یاد تازہ کر دی، ناظرین کو حیرت نہ ہونی چاہیے، کلام موجود ہے، ایک قصیدہ کے چند ابتدائی اشعار کی شانِ فارسیت ملاحظہ فرمائیں، کہتے ہیں :-

قتیلِ ناوکِ عشق تو ام نمی دانی
کہ چارہ سازی درد م تو نیز نتوانی

ہمانہ ہر بن مو شور العطش خیزد
ہزار خمکدۂ وصلم اگر بنوشانی

بہ ہجرت اشک بریزم ز جلوہ بگریزم
منم چو قطرۂ شبنم تو مہر تابانی

میان من و تو ربط خاک و خورشید است
ز تو گریزم و گرد خود بگردانی

فراز مرتبۂ عشق نیک می دانم
ز ہر زہ ہا کہ سرودم خورم پشیمانی

چہ مہر و ماہ کہ بام بلند ہمت ماست
ہزار پایہ فزون تر ز کاخ کیوانی

من از متاع دو عالم غم تو بر چیدم
گذاشتم بہ ملک لذت تن آسانی

خراب تلخی زہر آبۂ غمم کہ دو ست
فلک کہ داشت بہ من چشم لطف پنہانی

دو صد بہشت معانی بہ سینہ پنہان است
مرا بہ دیدہ نہ گنجد بہشت رضوانی

فلک بہ دامنش آورد ماہ و انجم ساخت
غبارہا کہ برانگیختم بہ جولانی

بہ سینہ کا دی خود صد گہر بروں فگنم — وزاں یکے نہ فروشم بلعل رمانی

ز پیکرے کہ وہم شاہدان معنی را — ہزار در شکند رنگ بر رخ مانی

مشام خلوتیان فلک شود شاداب — چو من ز خامہ فشانم رحیق ریحانی

پھر اور جوش میں آکر کہتے ہیں، اور کس قدر سچ کہتے ہیں:

شراب خم کدۂ فارس از لبم جوشد — اگرچہ من نہ صفاہانیم نہ کاشانی

زبسکہ خردۂ جاں می تراود از قلمم — نوید زندگیٔ نو دہم بہ قاآنی

یہ محض شاعرانہ تعلی نہیں ہے، ایک بہاریہ قصیدہ کے چند اشعار کا ترنم ملاحظہ ہو:

سزد گر باد نوروزی جنیں دامن کشاں آمد — کہ گل با فرد فیروزی بجشن بوستاں آمد

زبس جوش دمن اینک نگارین شد چمن اینک — تو گوئی کز زمین اینک پرند پرنیاں آمد

میان بستہ چنار آمد تو گوئی چوبدار آمد — بجا ؤشی ہزار آید کہ گل با عز و شاں آمد

صبا ہر سو شتاباں شد کہ گل چو ماہ تاباں شد — بیاباں ہا خیاباں شد جہاں باغ جناں آمد

صنوبر صف بزد ہر سو درق ہا کف بزد ہر سو — چو بلبل دف بزد ہر سو کہ عیش جاوداں آمد

درختاں گرد ش استادہ، ز ہر لطفش آمادہ — ز گل بسکہ افتادہ بہ ہر سو ارمغاں آمد

میان لالۂ و سوسن زداں شد جوئے در گلشن — نگر آئینۂ روشن بدست گلرخاں آمد

بگیتی ہر طرف بینی، ہمہ حسن ست و رنگینی — نگہ در شوق گل چینی سزد گر پرفشاں آمد

نشاط از بسکہ شد طاری فلک انگشت خود داری — چناں رقصد کہ پنداری بہ پیری نوجواں آمد

نم ابر و رم آہو، دم جوے و چم نازد — گہر ریزد جنوں خیزد دلا ویزد رواں آمد

گل از شبنم، ہوا از گل، دمن از نم، سبو از مل — قدح خوارد گہر بارد سبکسار و گراں آمد

ریاحیں بادل سادہ خوش اند از خواب افتادہ — کہ نرگس دیدہ بکشادہ زہر سو پاسباں آمد



صبا مستانہ می رقصد، دل دیوانہ می رقصد — یکے بے جانمی رقصد کہ ہنگامے چناں آمد

نہایت طویل قصیدہ ہے، شروع سے آخر تک ترنم ریزیوں کا یہی پر کیف عالم ہے، کیا ناظرین اب بھی کہیں گے کہ سہیل کے قالب میں قاآنی کی روح نغمہ گرائی نہیں کر رہی ہے؟

علی گڑھ کالج میں مسز سروجنی نائڈو کی آمد کے موقع پر سہیل نے ایک نظم لکھی تھی، جس کی موسیقیت نے خود بلبل ہند پر ایک وجد کی کیفیت طاری کر دی تھی، ان نغموں سے بھی ناظرین کچھ لطف اٹھا لیں:

شب چو مہر خاوری بروئے خود نقاب زد — زمانہ تاج سروری بہ فرق ماہتاب زد

شب از نشاط خرمی بکند رخت ماتمی — زمانہ فال بے غمی بہ عیش کامیاب زد

یکے خرد بہ سنگ زد رحیق لالہ رنگ زد — یکے بچنگ چنگ زد یکے دم از رباب زد

یکے چو لالہ جام زد یکے چو سرو گام زد — طرب صلائے عام زد کہ فتنہ سر بخواب زد

کنوں بچشم روشنی چو جلوہ زد سروجنی — فلک بہ سطح سوسنی بساط ماہتاب زد

تبسمش تجلئے، تکلمش ترنمے — سزد اگر تلاطمے بہ جان شیخ و شاب زد

اس شعر کی داد وہی دے سکتا ہے، جس کو مسز نائیڈو کی تقریر سننے کا موقع ملا ہو، واقعہ یہ ہے کہ تقریر کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی رباب رنگین کے پردے مشتعل ہو گئے ہیں، اور سامعہ نشاط انگیز موجوں میں ڈوب گیا ہے۔

اب اسی خوش نوائی کے ساتھ جس کا سماں اشعار مذکورۂ بالا میں نظر آرہا ہے، ناظرین کچھ بلند حقائق بھی سہیل کی زبان سے سن لیں۔ ایک ترکیب بند کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بہ می جاں ز جام جم نہ راز خود نہ محرم — ولی خود بیں کہ صد عالم بہ ہر داغش نہاں بینی

بگل برگے مشو خرم بہ پرتا ثیر اعظم — کہ ہیچ قطرۂ شبنم شعاعش زرد باں بینی

از ینم گام بیروں زن علم بر اوج گردوں زن — نوائے بر فلاطوں زن جہان بزم قدسیاں بینی

خودت را رشک قلزم کن بجوشِ آرزو تلاطم کن — چو موج مے تبسم کن اگر جوئے روان بینی

خودت بیں گر نخود مندی کہ تمثالِ خداوندی — بخود گر دیدہ بربندی خدا را کے توان بینی

اگر از خود خبر یابی چہ گویم تا چہ دریابی — فلک زیرِ اثر یابی ملک در آستاں بینی

کمند جذب قیس آں را کشاں در دستِ صحرا — تو در قص ناقۂ لیلےٰ بسعی ساربان بینی

تو اے یوسف نہ تنہا مترس از کثرتِ اعدا — بمردی شیشہ را بشکن زخود صد کارواں بینی

اس زور کلام کے بعد سہیل کا یہ مطالبہ

گرت باور نیاید دیدۂ معنی نگر وا کن — سہیلِ ناتواں واوجِ اقبالش تماشا کن

کچھ ناموزوں نہیں ہے۔

ایک مخمس جو سہیل نے قیام علی گڑھ کے دوران میں آبشار نرمدا کے کنارے بیٹھ کر لکھا تھا، جس کو پڑھکر ایران کے قدیم استاد فن منوچہری دامغانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ابر دگر باغ را اشہپرِ طاؤس داد — بادِ گل و لالہ را افسرِ کاؤس داد

جوئے چمن را بکف خنجرِ کاموس داد — نامیہ ہر غنچہ را پیکرِ ناقوس داد

باغ مگر شد کنشت، مرغ مگر شد شمن

بید طرزِ دہی ایں ہمہ ترساں چراست — طفلِ شگوفہ زبیم سر بگریباں چراست

سرو ز بہر گریز بر زدہ داماں چراست — گل بسرا پردۂ شاخچہ پنہاں چراست

ابر بسیزد گر دوش یا کہ غریوا ہرمن

ناظرین نے قدمائے ایران کا رنگ دیکھ لیا کہ سہیل کی طباعی اور ذہانت نے اس کا کس قدر کامیاب تتبع کیا ہے! کہیں سے لب و لہجہ غیر ایرانی نظر نہیں آتا، جدید فارسی کا بھی نمونہ سہیل نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:



صبح آمد و از فیضِ سحر نغمہ سرا شد — ہر غنچہ کہ وا شد

گل برگ تو گوئی ہمہ تن دستِ دعا شد — بہ بہ چہ بجا شد

صد شکر شبِ تیرۂ آفات سر آمد — صبحِ ظفر آمد

مہر طرب از پردۂ شب جلوہ نما شد — بہ بہ چہ بجا شد

صد شکر کہ باز آں قدحِ بادہ بگردید — پیرانِ مے توحید

گویند بمستاں کہ در میکدہ وا شد — بہ بہ چہ بجا شد

ہر اشک کہ از دیدہ فرو ریخت گہر شد — ہم دوش اثر شد

ہر نالہ کہ از سینہ بروں جست رسا شد — بہ بہ چہ بجا شد

ہر عقدہ کہ در حیطۂ تدبیر نبودہ — تقدیر کشودہ

ہر کام کہ ملت ز خدا خواست روا شد — بہ بہ چہ بجا شد

ارباب ذوق انصاف کی نگاہ سے دیکھیں اور غور کریں، میں نے جو اشعار اب تک نقل کیے ہیں کیا سہیل کے صحیح ذوق فارسیت اور غیر معمولی قدرت زبان کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہیں؟ ان کا نام ظاہر نہ کیا جائے تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ مطرب رنگیں نوا اعظم گڈھ کی خاک سے پیدا ہوا تھا، تسلیم کرنا پڑے گا کہ چمن زار ایران کا کوئی بلبل ہے، جو نغمہ سرائی کر رہا ہے سہیل نے بالکل سچ کہا ہے،

لبِ من چشمہ چشمہ بادۂ شیراز می ریزد — اگرچہ آب و گل از خطۂ ہندوستاں دارم

جواہر پارہ ہا خواہی بہل تا سینہ بشگافم — نہ دانی کاندریں ویرانہ صد گنجِ نہاں دارم

بہار نطق من صد سنبلستاں در بغل دارد — کہ سیرابی ز رشحِ فیضِ سحبانِ زماں دارم

وہ "سحبان زماں" کون ہے، ان ہی کی زبان سے سنیے:

ز شبلی کردہ ام دریوزۂ فیضِ نغز گفتاری — مرا زیبد اگر روح القدس را ہمزباں دارم

سہیلؔ! تجھکو یقیناً روح القدس کی ہمزبانی زیب دیتی ہے، تو خود ایک جوہر قابل تھا، تیرے لب بے شبہ گوہر فشاں تھے، تیرا قلم یقیناً چمنستان ادب کا سرو رعنا تھا، تیرا دماغ اس میں شک نہیں، اسرار و معانی کا ایک جگمگاتا ہوا ستارہ تھا، لیکن ہم کو اس پر حیرت کیا ہو، تجھکو ایک ایسے آفتاب علم و فن کی ضوفشانیاں نصیب ہوئی تھیں، جو ایک مدت دراز کے بعد حیرت انگیز تابانیوں کے ساتھ افقِ عالم پر جلوہ گر ہوا تھا، اور جس کے دوبارہ ظہورِ جمال کے لیے دنیا کو لیل و نہار کی سینکڑوں کروٹوں کا انتظار کرنا پڑے گا،

سہیل کی روح کو غالباً ملال ہوگا، اگر اس موقع پر ان کی وہ پرسوز نظم قلم انداز کردوں، جو انھوں نے اپنے محترم استاد کی یاد میں لکھی تھی، اور جسکو وہ خود جذبات سے مغلوب ہوکر دو تین شعر سے زیادہ نہ پڑھ سکے تھے، اسکے چند شعر یہ ہیں،

جمع در یک پیکرِ شبلی جہانے بودہ است
یوسفِ گم گشتہ، ما کاروانے بودہ است

ہم بہ آہنگِ حجاز از ہمصفیراں بردہ گوے
ہم بہ گفتار دری شیوا بیانے بودہ است

لالہ زارِ دین و دانش را نوید نوبہار
جو بیارِ فضل را سرو روانے بودہ است

خامہ در انگشت ہا یش رایتِ کشور کشا
نامہ در دستش درفشِ کاویانی بودہ است

حیف کز بے دانشی با قدر او نشناختیم
کاو بما از پردۂ غیب ارمغانے بودہ است

آخری شعر کی شان ملاحظہ ہو، کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں:

حیف باشد گر فرود آید پس از وے پیش کش
کایں سرشوریدہ ام بر آستانے بودہ است

ظاہر ہے کہ ایسے مخزن انوار سے فیض یاب ہوکر تابشِ سہیلؔ پھر کسی اور جلوے سے کب شرمندہ ہوسکتی تھی!

سہیلؔ کا یہ جوش عقیدت صرف ان ہی چند اشعار تک محدود نہ تھا، علامۂ مرحوم کی وفات پر انھوں نے ایک طویل مرثیہ کے ذریعہ سے اپنے درد دل کا اظہار کیا تھا، یہ مرثیہ ایک ترکیب بند کی شکل میں ہے، جو متعدد بندوں پر مشتمل ہے، اور علاوہ سوز و گداز کے زبان کی صحت کے لحاظ سے بھی ارباب فن کے لیے خاص توجہ کے قابل ہے، جستہ جستہ کچھ اشعار ہم نقل کرتے ہیں، آغاز کا حکیمانہ انداز بیان ملاحظہ ہو،



جائے نشاط در چمن روزگار نیست
آبِ روانِ سرو جنبشِ باد بہار نیست

کو لالہ کو داغِ جگر در نہاں نداشت
کو نو گلے کہ چاکِ دلش آشکار نیست

خونے ست توبہ تو کہ گلش نام کردہ اند
زہریست سر ز زمین سبزہ زار نیست

زنہار چشم دل بفریبِ زخش مدوز
دنیا عجوزہ ایست عروس نگار نیست

یارے کزیں خرابہ رود در غمش منال
کاین کاخ را اساس بقا استوار نیست

ابرو کشادہ دار بہ شیرین و تلخِ دہر
دانی کہ نوش و نیشِ جہاں پائدار نیست

لیکن پھر بھی محترم استاد کی یاد بے قابو کردیتی ہے، اور یوں ماتم سرا ہوتے ہیں،

دردا کہ گنج دار معارف ز دہر رفت
واحسرتا کہ شبلیِ معجز نگار شد

آوخ کہ ہمچو گنج بہ خاکش نہاں کنند
کز وے ہزار گنج نہاں آشکار شد

گلزار دیں کہ از نمِ کلکش بہار داشت
بے برگ ماندہ است کز آں آبیار شد

یہ درد دل اب برابر پھیلتا جارہا ہے، اب یوں خطاب کرتے ہیں:۔

غافل ز حالِ ملتِ بیضا چگونۂ
خامش دریں قیامتِ صغریٰ چگونۂ

ایں جا دلت طپید بہ ہجرانِ مصطفےٰ
در خلوتِ وصال بغیر ما چگونۂ

در فکر قوم سیر چمن خوش نہ داشتی
در حیرتم بہ خلد شکیبا چگونۂ

در چارہ انگ دہر نظیرت نہ داشتی
ایں جا یگانہ بودی و آنجا چگونۂ

با خاکیان تیرہ دروں سخت زیستی
با قدسیانِ عالمِ بالا چگونۂ

اس میں شبہہ نہیں کہ شاگرد کو استاد سے جو غیر معمولی عقیدت و محبت تھی، اس کی مثال موجودہ زمانہ میں مشکل سے مل سکتی ہے، کچھ عجیب جذبۂ احترام کے ساتھ یہ نام ان کی زبان سے ہمیشہ نکلتا تھا، سہیلؔ اپنی زبان آوری کے سامنے مشکل سے کسی کو خاطر میں لاتے تھے، لیکن جب اس مجسمۂ علم و فن کی شانِ کبریائی کا سامنا

ہوتا تھا، تو ہم نے دیکھا ہے کہ ان کی گردن جھکی رہتی تھی سہیل دنیا سے رخصت ہو گئے، اس کا کیا غم کیا جائے کہ ایک دن ان کو جانا ضرور تھا، لیکن

"افسوس کز قبیلۂ شبلی کسے نماند"

خیالات کے ہجوم نے اس مضمون کو کچھ طوالت دیدی، ارادہ تھا کہ اب قلم کی رفتار کو یہیں روک دوں لیکن سہیل کی کچھ اور خصوصیات یاد آگئیں، جن کے بغیر انکی زندگی کی یہ تصویر غالباً نامکمل رہ جاتی۔ ناظرین نے سہیل کے شاعرانہ کمالات کا منظر تو دیکھ لیا لیکن میں ابتک ان کی نثر نگاری کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکا، حالانکہ اس کا ذکر مضمون کے ابتدائی سطور میں کہیں آچکا تھا، اس وقت میرے پیش نظر صرف ان کا وہ تبصرہ ہے، جو انھوں نے اصغر مرحوم کی شاعری پر سپرد قلم کیا تھا، ہم جستہ جستہ اس کے کچھ ٹکڑے نقل کرتے ہیں، جن سے ناظرین ان کی ادیبانہ طرز نگارش کا کافی طور پر اندازہ کر سکتے ہیں، حدود شاعری کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فنون لطیفہ کی تقسیم چہارگانہ میں شاعری مسلمہ طور پر سب سے بلند تر ہے، اس کی وجہ محض اس قدر ہے کہ شاعری بقیہ اصناف کی جامع محاسن ہے، اس کے علاوہ شاعری کے قلمرو میں حقائق و معارف، اسرار و حکم کی غیر فانی دنیا بھی شامل ہے، جہاں مصوری و موسیقی کو کوئی دسترس نہیں، مصور کا قلم صرف ان ہی کیفیات نفسی کی تصویر کھینچ سکتا ہے، جن کا اظہار عوارض جسمانی سے ممکن ہے، لیکن شاعر کی نگاہ نفس انسانی کی ان گہرائیوں تک پہنچتی ہے، جہاں کیف و کم کی گنجائش نہیں ہے،

ایک شاعر کا تخیل عالم قدس تک پرواز کرتا ہے، اور ایک نشۂ بے کیف اور معنیٔ بے صورت کو پیکر خیالی دے کر آپ کے پیش نظر کر سکتا ہے، ایک مغنی اپنے ترانۂ جاں نواز سے صرف روح میں انبساط پیدا کر سکتا ہے، مگر ایک شاعر اپنے ترنم سے نفس ناطقہ پر بھی عالم وجد و حال طاری کرنے کی قدرت رکھتا ہے"



آگے چل کر اسرار و معارف کے عنوان میں لکھتے ہیں:

"یہانتک وسعت آباد سخن کی وہ منزلیں تھیں، جہاں تک دوسرے فنون لطیفہ کی رسائی ممکن ہے، لیکن اس سدرۃ المنتہی کے آگے اسرار حکمیہ اور معارف الٰہیہ کی بزم تجلی شروع ہو جاتی ہے، جہاں صرف شاعر کے تخیل کو باریابی کا اذن مل سکتا ہے، اگر ایک شاعر عالم رنگ و بو سے گذر کر فلسفہ و حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ، مذہب کے اسرار و رموز اور مراحل سلوک و عرفان کی کیفیات مجردہ اسی ترنم، اسی جدت بیان اور اسی حسن مصوری کے ساتھ ادا کرتا ہے، تو اس کی شاعری سحر سے گذر کر اعجاز بن جاتی ہے"......

"جس طرح عناصر کے قوام و ترکیب سے جو مزاج پیدا ہوتا ہے، وہ ہر ذی روح میں مختلف ہوتا ہے، اسی طرح ہر شاعر کا نمونۂ کلام بھی مختلف ہوتا ہے' اس اختلاف رنگ سے ان کے مدارج کمال میں فرق پیدا نہیں ہوتا، بشرطیکہ رنگ خود سفیہانہ اور مبتذل نہ ہو، جس طرح پہاڑ کی چوٹی سے آبشار کی وسیع چادر کا مرغزار کے دامن میں زور شور سے گرنا اور اس پر آفتاب کی کرنوں سے عالم نور پیدا ہو جانا بجائے خود ایک حسن مستقل ہے، اسی طرح سرو کی دو رویہ قطاروں کے درمیان سے ایک خفیف ترنم کے ساتھ جوئے رواں کا بل کھا کر نکلنا اپنی جگہ پر ایک نغمۂ رنگیں ہے، اگر پھول کی پنکھڑی پر آفتاب صبح کی دوشیزہ شعاعوں کا رقص دلآویز ہے' تو دامن صحرا میں طاؤس طناز کا عالم بے خودی میں ناچنا کچھ کم نشاط انگیز نہیں"۔

"ایک شاعر اور ایک نقاش کی مصوری میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نقاش حس باصرہ کے ذریعہ سے اپنے مخاطب سے اپیل کرتا ہے، مگر شعر کی معنویت اور موسیقی باہم مل کر ایک طرف سامعہ کے ذریعہ سے شاعر کے احساسات کو مخاطب کی طرف منتقل کرتی ہیں اور دوسری جانب

تخیل اس کیفیت کو مجسم کر کے نگاہ کے سامنے کر دیتا ہے، اور اگر مصوری کے ساتھ اسرار و معارف کا بھی کوئی نکتہ شعر میں ادا ہوا ہے، تو نفس ناطقہ بھی متاثر ہوتا ہے، اور اگر نکتہ میں ذوق عرفان کی بھی کوئی چاشنی ہے تو انسانیت کے اس ملکوتی عنصر پر بھی عالم وجد و حال طاری ہو جاتا ہے جس کو عام طور پر روحانیت کہتے ہیں ؛؛

علاوہ اس سحر طراز قلم کے جس کی رعنائی و برجستگی ناظرین اقتباسات مذکورۂ بالا میں دیکھ رہے ہیں، قدرت نے سہیل کو ایک گوہر فشاں زبان بھی عطا کی تھی، جس کی حیرت انگیز قوت گویائی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھوں نے ان کو کسی علمی یا ادبی مسئلہ پر گفتگو یا کسی جلسۂ عام میں تقریر کرتے سنا ہو، وہ صرف مقرر نہ تھے، بلکہ خطیب تھے، اور خطیب بھی ایسے جس کو تقریر سے قبل کسی غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، کھڑے ہوتے ہی پر شکوہ الفاظ و خیالات کا دریا بہنے لگتا تھا، شاعری کا بھی یہی عالم تھا، صرف چند گھنٹوں میں بڑی سی بڑی نظم تیار ہو جایا کرتی تھی، غرض ان کا دماغ تقریر و تحریر دونوں ہر موقع پر حاضر رہتا تھا، بدیہہ گوئی ان کی ایک قابلِ فخر خصوصیت تھی وہ اکثر مضمون زبانی لکھوا دیا کرتے تھے، لیکن عبارت کی ادیبانہ شان میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، یہ ہر صاحب قلم کے بس کی چیز نہ تھی، خوش نویسی کے فن سے بھی واقف تھے، خط نہایت پختہ اور خوبصورت ہوتا تھا، خوش گو ہونے کے علاوہ خوش لہجہ بھی تھے، آواز میں ایک خاص ترنم تھا، جس سے سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، غرض ان کے ساتھ قدرت کی فیاضیاں کچھ کم نہ تھیں، لیکن ان کی شان بے نیازی بھی حیرت انگیز تھی، اولادِ ظاہری پر تو جان دیتے تھے، لیکن اولادِ معنوی کے حق میں ایسا بے درد باپ مشکل سے مل سکتا تھا، ان کی شاعری کی مدت کسی طرح پچاس سال سے کم نہ تھی، اس طویل مدت میں ہزاروں لاکھوں اشعار کہے ہوں گے، لیکن حالت یہ تھی کہ نظم لکھنے کے بعد پھر ان کو اس کی خبر نہیں رہتی تھی کہ وہ نظم کیا ہوئی، اور اس کو کون اٹھالے گیا، اس بنا پر خیال ہے کہ ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ ضائع ہو گیا،



لیکن اس کا ان کو کیا غم ہو سکتا تھا، ان کے دماغ پر تو عرفی کے اس شعر کا نشہ چھایا ہوا تھا،

گفتہ گر شد زِ کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست ازدو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

غرض اقلیم بے نیازی کے اس فرماں روا کو زندگی میں اپنے ان گم شدہ جواہر پاروں کی تلاش کا کبھی خیال نہیں آیا، احباب کبھی کلام کی ترتیب اشاعت کا خیال ظاہر کرتے تو کچھ عجیب بے رخی سے ٹال دیتے، لیکن کرتے کیا، ان کے پاس تھا ہی کیا، جس کو کوئی لے کر شائع کرتا، کچھ دماغ میں محفوظ ضرور تھا، لیکن اس کو بھی لکھوانے سے گریز کرتے، پھر بھی ادبی دنیا کو جناب نیاز احمد صدیقی پرنسپل محمد حسن انٹرمیڈیٹ کالج جونپور کا شکر گذار ہونا چاہیے، جن کی تلاش و جستجو کی بدولت سہیل کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ چھپ کر ارباب ذوق کے سامنے آگیا، آج یہ مجموعہ ہمارے پیش نظر نہ ہوتا تو ہم نے سہیل کے شاعرانہ کمالات کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اس کی تائید میں ہم کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے تھے،

سہیل کے علمی اور ادبی کمالات دیکھنے کے بعد ناظرین اگر یہ بھی جاننا چاہیں کہ بحیثیت انسان کے ان کی زندگی کا کیا عالم تھا، تو یہ خواہش کچھ بے جا نہ ہوگی، حلقۂ زہاد میں جہاں صرف ظاہری رسوم و آداب کا اتباع معیار تقدس سمجھا جاتا ہے، ممکن ہے کہ وہ باریابی کے شرف سے محروم رہے ہوں، لیکن ان کے دل کی دنیا کچھ ایسی اخلاقی خوبیوں سے منور تھی، جو موجودہ دور نفس پرستی میں رفتہ رفتہ ناپید ہو رہی ہیں، باوجود صاحب کمال ہونے کے مزاج میں حد درجہ انکسار، سادگی اور مروت تھی، لیکن خودداری اور عزتِ نفس کا سر رشتہ کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا تھا، خود غرض نہ تھے، دوسروں کی ممکن امداد سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے، ذاتی نفع و نقصان کا بہت کم خیال رہتا تھا، طبیعت منافقانہ تصنع و تکلف سے قطعاً ناآشنا تھی، دنیاوی مال و دولت اور جاہ و اقتدار کی طمع سے کوسوں دور تھے، موجودہ طرز تمدن کی ظاہری زینت و آرائش سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا، اسلامی سادگی کے مجسم تصویر تھے، وضع و قطع، رفتار و گفتار، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے وغیرہ کی کسی ادا میں رعونت یا مصنوعی شان و

شوکت کا شائبہ تک نہ تھا، کسی جلسے میں جاتے تھے تو ان کی یہ خواہش نہیں ہوتی تھی کہ ان کا کوئی شاندار استقبال کیا جائے، اور کسی ممتاز جگہ پر ان کو بٹھایا جائے، کسی گوشہ میں جہاں جگہ ہوتی تھی، خاموشی کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے، لیکن جو بلندی خدا نے ان کو عطا کی تھی، وہ نگاہوں کو خود اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتی تھی، احباب و اعزہ کے ہمیشہ ہر طرح پر خدمت گزار رہتے تھے، دل نہایت نرم، رقیق اور کشادہ تھا، اس میں بجز اخلاص و محبت کے کسی قسم کی سختی یا شقاوت نہ تھی، کسی کی دل شکنی اور حق تلفی نہیں کرتے تھے، اپنی تکلیف و راحت کی مطلق پروا نہ تھی، وہ ان لوگوں میں تھے جن کو اپنے نفس کی پرورش میں نہیں بلکہ دوسروں کی خدمت میں لطف محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ انھوں نے خود اپنے اس شعر میں کہا ہے،

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال  راحت اغیار کو دی آپ پریشاں ہو کر

یہ شاعری نہیں ہے، بلکہ ان کی زندگی کی صحیح تصویر ہے، جس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے، غرض سہیل اسی دنیائے مادی کے ایک انسان تھے، فرشتہ نہ تھے، کمزوریوں کا ہونا کچھ محل تعجب نہیں، لیکن اگر ہاتف شیراز کی اس دلفروز نصیحت

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن  کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

پر سہیل کا عمل رہا ہے، اور یقیناً رہا ہے، تو انسانیت کی عام سطح سے ان کو کچھ ضرور بالاتر کہا جا سکتا ہے، ہمارے نزدیک تو ان کی اخلاقی بلندی کے لیے یہی بہت کافی تھا کہ ان کے دست و بازو میں مردم آزاری کی قابلیت نہیں تھی، خواجہ حافظ کی یہ صدائے شکر ان کی زبان سے بھی بجا طور پر بلند ہو سکتی تھی۔

من از بازوے خود دارم بسے شکر  کہ زور مردم آزاری ندارم

باوجود فلسفی ہونے کے سہیل کی طبیعت نہایت ظریف، حاضر جواب اور بذلہ سنج واقع ہوئی تھی،



لیکن مذاق ابتذال سے آلودہ ہونے نہیں پاتا تھا، لطافت اور شائستگی کی شان ہمیشہ قائم رہتی تھی، گفتگو نہایت دلچسپ انداز سے کرتے تھے جس کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہتا تھا، سامعین تھک جاتے تھے لیکن خود انکو کوئی تھکن محسوس نہیں ہوتی تھی، بحث و مناظرہ میں ان کا فریق مخالف مشکل سے دیر تک پابرجا رہ سکتا تھا۔

ان کے اعمال کیا تھے؟ اس کے متعلق صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو اصغر مرحوم کا یہ شعر

تھی ہر عمل میں دعوی ہستی کی معصیت  مستوں نے اور راہ نکالی ثواب کی

بہت پسند تھا، روزہ نہایت پابندی کیساتھ رکھتے تھے، اسلیے کہ بقول ان کے اسمیں اک گونہ ترک عمل کی شان تھی جس سے انکو بہ نسبت عمل کے زیادہ دلچسپی تھی، رہے عقائد تو بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس لحاظ سے وہ صحیح معنوں میں بندۂ توحید اور بارگاہ رسالت کے حلقہ بگوش تھے، مدت العمر کبھی ایسے مراسم میں شرکت نہیں کی جنمیں شرک و بت پرستی کا ذرہ برابر بھی شائبہ پایا جاتا ہو، غرض جہاں تک خالص عقائد کا تعلق ہے، انکے عقائد وہی تھے جن کی تعلیم شارع اسلام نے دی تھی، جب موقع آتا تھا تو وہ نہایت مضبوطی اور آزادی کیساتھ ہمیشہ اپنے ان عقائد کا اعلان کرتے تھے، وہ اپنے مذہب کی حقیقت سے بخوبی واقف تھے، اسلیے ان کو اپنا مذہب سب سے زیادہ عزیز تھا، ایک شعر میں اس کا اظہار کر کے انھوں نے اپنی اخلاقی جرأت کا بھی ثبوت دیا ہے، ملاحظہ ہو:

وطن پیارا ہے ہم کو دیں مگر اس سے بھی پیارا ہے  فدا ہوں گے وطن پر رہ سکے گر ہم مسلماں بھی

سہیل نے جو شرط لگائی ہے، موجودہ فضا میں تو اس کے پورے ہونے کی صورت نظر نہیں آتی، لیکن اس موضوع کے چھیڑنے کا یہ محل نہیں کہ اب ہم کو سہیل سے رخصت ہونا ہے۔

معلوم نہیں میرا یہ ناچیز قلم سہیل کے گوناگوں کمالات کے بے نقاب کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے، لیکن انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک اجمالی خاکہ ناظرین کے سامنے ضرور آگیا ہے، جس کی بنا پر غالباً انکو میرے اس خیال سے اختلاف نہ ہوگا کہ میں نے اس جوہر قابل کی جو کچھ مدح و ستائش کی ہے، وہ واقعیت سے خالی نہیں ہے، اس کا ثبوت ان کے سامنے ہے، حق و انصاف کو اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔

# کچھ کتاب نورس کی بابت

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب

کتاب نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ کو میں نے اپریل ۱۹۵۵ء میں اردو میں شائع کیا، ابھی اس کو شائع ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ مجھے ایران آجانا پڑا، اس وقت تک اس پر صرف دو ایک جگہ تبصرہ ہوا تھا، جو کافی حوصلہ افزا تھا، دوستوں نے ضرورت سے زیادہ ہمت افزائی کی لیکن ایران چلے آنے کے بعد مجھے کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ اس پانچ، چھ ماہ میں اس کے متعلق کس کس قسم کے خیالات کا اظہار ہوا حسن اتفاق سے اسلامک کلچر حیدرآباد کے شمارہ ماہ جنوری ۱۹۵۶ء (ج ۳۰ نمبر ۱) میں میرا ایک مضمون شائع ہوا، جو ایران میں سفارت ہند کے توسط سے مجھے مل گیا، اسی شمارہ میں کتاب نورس پر ایک طویل تبصرہ بھی دیکھنے میں آیا جو باریک ٹائپ کے ۶ کالموں پر مشتمل ہے، تبصرہ نگار بھی بڑی حیثیت کے مالک اور اردو کے چوٹی کے ادیب ہیں، یعنی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب جن کے نام نامی سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میری حقیر سی چیز ایسے حضرات کے لیے باعث توجہ ہوئی، لیکن تبصرہ پڑھنے کے بعد مایوسی ہوئی، اس کی وجہ یہ نہیں کہ تبصرہ نگار کے نزدیک میری سعی نامشکور رہی، بلکہ انھوں نے جو کچھ لکھا بڑی عجلت سے لکھا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اس مختصر سی کتاب کو بھی غور سے پڑھنے کی زحمت نہیں گوارا کی، اگر وہ غور سے پڑھ لیتے تو ان کی بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جاتیں اور مجھے دوبارہ ان کی طرف توجہ کرنے کی



زحمت نہ کرنا پڑتی، ایک بات کا افسوس اور بھی ہے کہ اس کتاب پر تبصرہ لکھتے وقت ڈاکٹر صاحب موصوف کو چند اور چیزوں پر نظر رکھنے کی ضرورت تھی، ادھر چند سالوں میں کتاب نورس پر کافی مواد فراہم ہو چکا ہے، ایک مختصر سا مضمون سید نصیر الدین ہاشمی صاحب نے لکھا تھا، جو اب "مقالات ہاشمی" میں شامل ہے، دوسرا نہایت اہم مضمون مسٹر گیانی کیوریٹر پرنس آف ویلس میوزیم بمبئی نے اسلامک کلچر جلد ۱۹ شمارہ ۲۱ میں آج سے ۱۱ سال قبل شائع کیا تھا، اس مضمون میں کتاب مذکور پر نہایت صفائی سے روشنی ڈالی گئی ہے، راقم نے بھی اردو ادب میں ایک مضمون اسی عنوان سے شائع کیا، پھر کسی قدر اضافے کے ساتھ میرا دوسرا مضمون اسلامک کلچر جلد ۲۸ شمارہ ۲۵ میں شائع ہوا، اور ایک مختصر مضمون معارف اعظم گڈھ میں اسی زمانہ میں چھپا، یہی مضمون میرے کتابچہ "تحقیقی مطالعے" میں کسی قدر اختصار کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا، اگر ان میں سے کچھ مضمون بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذرے ہوتے تو ان کا تبصرہ اچھا ہوتا، مجھے صاحب موصوف سے یہی شکایت ہے کہ انھوں نے زیادہ چھان بین نہیں کی جس کی بنا پر ان کے تبصرے میں طرح طرح کی غلطیاں رہ گئی ہیں، اس لیے راقم الحروف کو چند سطریں لکھنا پڑیں، ابھی چونکہ بعض کتابیں میرے سامنے نہیں ہیں، اس لیے ہندوستان واپس آنے کے بعد انشاء اللہ بعض پہلوؤں پر مفصل بحث کی جائے گی، لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کروں، مناسب یہ ہے کہ پہلے ڈاکٹر صاحب کے انگریزی تبصرے کا ترجمہ کر دیا جائے تاکہ ناظرین کو فیصلہ کرنے اور کسی خاص نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو:

"کتاب نورس (اردو) مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، شائع کردہ دانش محل لکھنؤ ضخامت ۱۶۸ صفحہ قیمت عہ

۱۔ کتاب نورس ابراہیم عادل شاہ (۹۸۸-۱۰۳۷ھ) کی نظموں کا مجموعہ ہے، یہ بادشاہ بیجاپور کے عادل شاہی خاندان کا چھٹا سلطان گزرا ہے، وہ علم و ادب اور موسیقی کا بڑا قدردان تھا، اس کے ۴۸ سالہ طویل عہد حکومت میں بیجاپور علم و ادب، فن موسیقی و تعمیر کا بڑا مرکز بن گیا تھا، علوم و فنون

کے سینکڑوں ماہرین اس کے دربار میں ایران، عرب، عراق، شمالی ہند اور گجرات سے کھنچ آئے تھے،
جب گجرات پر اکبر کا قبضہ ہو گیا تو اس بادشاہ نے قیمتی ہدایا کے ساتھ اپنے سفیر بھیجے، اور گجرات کے ماہرین
علم و ہنر کو بیجاپور آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ بیجاپور آئے اور انعام سے مالامال ہوئے، اس کے
دوران حکومت میں بہت سے لوگ بیجاپور چلے آئے جس کا اثر یہ ہوا کہ یہاں کی زبان اتنی متغیر ہو گئی کہ
بعض دکھنی شاعروں نے اپنی زبان کو گجری کہنا شروع کیا، اس سے ظاہر ہے کہ ان کے طرز تحریر میں نمایاں
تغیر ہو گیا تھا۔

۲- ابراہیم عادل شاہ نے خود بہت سی نظمیں ایسی زبان میں لکھیں جو نہ دکھنی ہے اور نہ گجری، بلکہ
ایسی مخلوط زبان ہے ... جو اس زمانے میں موسیقی کے لیے سارے ہندوستان میں رائج ہو گئی
تھی، اس مخلوط زبان میں کنڑا زبان کا خاص حصہ ہے، جو اس وقت وہاں کی مروجہ زبان تھی،

۳- ڈاکٹر نذیر احمد نے تقریباً دس نسخوں کی مدد سے ان نظموں کا متن تیار کر کے مقدمہ اور ترجمہ
کیساتھ شائع کر کے ہندوستانی موسیقی اور علم لسانیات کی بڑی خدمت انجام دی ہے، مصنف کی زندگی کا جو خاکہ انھوں نے پیش کیا ہے
وہ پوری طرح تسلی بخش نہیں، ان کو شاہ شاعر کی مکمل سوانح عمری لکھنا چاہیے، کیونکہ اسکی زندگی اہم سیاسی او اجتماعی واقعات
سے پُر ہے، اس کی پیدائش اس کا سلسلۂ نسب اور اسکی چچی چاند سلطانہ کا اثر نہایت تفصیل سے بیان کرنا چاہیے تھا،
کیونکہ ابراہیم عادل شاہ کی ادب پروری، وسیع النظری، سخاوت اور شجاعت چاند سلطانہ ہی کے اثر کی رہین منت
ہے، مرتب نے یہ تو ذکر کیا ہے کہ سلطان نو سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، لیکن اس عمدہ ماحول کی
طرف اشارہ نہیں کیا، جس میں چاند سلطانہ کی زیر نگرانی اس کی تربیت ہوئی،

۴- انھوں نے یہ بھی ذکر نہیں کیا کہ ابراہیم عادل شاہ کا دور شاعری اور موسیقی کے لیے بڑا
سازگار تھا، اس کے تمام معاصر مثلاً الیزبیتھ ملکۂ انگلستان، لوئی چہاردہم شاہ فرانس، شاہ عباس
والی ایران، اکبر اعظم والی ہند، اور محمد قلی قطب شاہ فرمانروائے گولکنڈہ علم و ادب کے بڑے مربی ہوئے ہیں،



مرتب اگر ان بادشاہوں کا مقابلہ علم و فن کے مربی کی حیثیت سے کر لیتے تو واضح ہو جاتا کہ ابراہیم نہ صرف
علم و ادب کا قدردان تھا، بلکہ اس نے ہندوستانی شاعری اور موسیقی میں ایک عجیب و غریب کتاب
لکھ کر مشہور شاعروں اور موسیقی دانوں سے "جگت گرو" کا لقب حاصل کر لیا تھا، وہ کرناٹک موسیقی
کا مصلح اور مربی تھا، اور یہی جنوبی ہند کی نہایت ترقی یافتہ موسیقی کا اسکول ہے، اسی بنا پر اس نے
بہت سے گیت کنڑا راگ کے ذیل میں نظم کیے ہیں، لیکن اس کی طرف مرتب متوجہ نہیں ہو سکے،

۵- مرتب کو کم از کم ابراہیم نامہ ضرور مطالعہ کر لینا چاہیے تھا، یہ دکھنی مثنوی بادشاہ کی زندگی
کی تمام جزئیات پر مشتمل ہے، اس میں اس کے روزانہ کے معمولات، اس کے محل، اس کے محبوب
ہاتھی اور گھوڑے، اس کے ساز موسیقی اور دوسری جزئیات کا بیان ہے، اس کتاب کے خطی نسخے
ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) اور راجا صاحب اوندھ کے کتاب خانے میں محفوظ ہیں، انھوں
نے ایک اور مطبوعہ کتاب کا ذکر نہیں کیا جو ابراہیم عادلشاہ کی نابالغی کے نائبین کے حالات پر
مشتمل ہے، اس کے مصنف علی محسن ہیں اور عثمانیہ گریجویٹ ایسوسیشن کی طرف سے ۱۹۳۲ء میں شائع
ہو گئی ہے۔

۶- نورس کو دکھنی زبان کی کتاب تصور کرنا غلط ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے ابراہیم عادلشاہ
کے زمانے کی دکھنی زبان کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے، شاہ میران جی اور شاہ جانم نے ابراہیم
کی پیدائش سے پہلے اور بعد میں دکھنی میں نظمیں لکھیں، ان شاعروں کی کتابیں ہندوستان کے
کتابخانوں میں محفوظ ہیں، اور بعض نظمیں زیور طبع سے آراستہ بھی ہو چکی ہیں، جانم کی سہلا
الہ آباد یونیورسٹی کے مجلہ میں شائع ہوئی اور بہت سے اقتباسات اردو شہ پارے، اردوئے قدیم
دکھن میں اردو اور تذکرۂ اردو مخطوطات میں طبع ہوئے ہیں،

۷- یہی وجہ ہے کہ نورس کی زبان سے متعلق ملاحظات میں اشتباہ ہوا ہے، جن سے

طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور غلط اطلاع بھی مل رہی ہے۔ مرتب نے برج بھاشا
اور کنڑا کے الفاظ، اصطلاحات اور اشتقاقات فعل کا وجود تسلیم نہیں کیا ہے، اور اسی بنا پر بہت سی
نظموں کو نہیں سمجھا، اور ان کا غلط ترجمہ کیا ہے۔ مقدمہ کتاب نورس کا جو حصہ دستور زبان اور خصوصیات
سے متعلق ہے وہ "ہندوستانی زبان اور اس کے لسانیات" مؤلفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
سے نقل کر دیا گیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا گیا ہے،

۸۔ مرتب بہت سے دکھنی الفاظ اور فقرے بھی نہیں سمجھ سکے ہیں، ابراہیم کی والدہ معمولاً "بڑے
صاحب" کہلاتی تھی، مرتب نے بڑی صاحبہ، پڑھا جو غلط ہے، نصرتی اور دوسرے بیجاپوری شاعروں
نے اپنی نظموں میں بڑے صاحب ہی لکھا ہے، مرتب کو معلوم نہیں کہ دکن میں عزت آب خواتین
کو مردوں کی طرح خطاب کرتے تھے، آج بھی "بیگم صاحبہ بولیں" نہیں کہتے "بیگم صاحب بولے" کہتے
ہیں۔ دوسری غلط پڑھنے کی مثال کنچنی[1] (= ناچنے والی عورتیں) ہے، جسکو گنیجن[2] پڑھا ہے۔ اس طرح
کی بہت سی مثالیں نورس کے متن میں پائی جاتی ہیں، مثلاً اچرچ بجائے اچرج اور ملکیجہاں بجائے
ملکۂ جہان،

۹۔ مرتب نے ابراہیم عادلشاہ کے مذہبی رجحانات کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے اگر
وہ اس کو لکھتے تو کتاب نورس کے بعض حصوں کے متعلق بہت اچھا مواد فراہم ہو جاتا، اکبر کی طرح
ابراہیم نے اپنے مذہبی معتقدات کئی بار تبدیل کئے[3]۔ وہ سنی پیدا ہوا لیکن بچپن ہی میں اپنے چچا علی عادلشاہ
کا مذہب اختیار کر لیا، چاند سلطانہ کے زیر اثر پھر سنی ہو گیا، بعد ازاں شیعہ ہوا، بالآخر مہدویت و
وہابیت کی ترویج میں پورا حصہ لیا، اسی اثنا میں اس کا میلان اکبر کی طرح ہندویت کی طرف بھی ہوا،

[1] کاف مفتوح، نون ساکن، چ مفتوح، ن مکسور، ی ساکن (ن) [2] گ مضموم، ن مکسور، ی ساکن، ج مفتوح
ن ساکن (ن)، [3] انگریزی تبصرہ میں قوسین میں "امامیہ یا شیعہ" کا اضافہ غیر مربوط ہے۔ (ن)



یہی وجہ ہے کہ اس نے دیوی دیوتاؤں کی تعریف بعض گیتوں میں کی ہے جس کے متعلق مرتب کا یہ خیال
غلط ہے کہ یہ بات موسیقی کے اثر و نفوذ کا نتیجہ ہے۔

۱۰۔ ایک بڑی غلط بات جو مرتب نے لکھی اور جس پر بڑی تفصیل سے بحث بھی کی ہے وہ یہ ہے کہ
وہ نورس کو ایک مسلسل کتاب سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کی تدوین و ترتیب بھی کسی خاص موقع پر نہیں
ہوئی، ابراہیم نے زندگی کے مختلف حصوں میں ان گیتوں اور دوہوں کو مختلف موضوع پر نظم کیا ہے،
یہی حال محمد قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ کے دیوان کا بھی ہے[1]، یہ دونوں معاصر مختلف تقریبوں
کے موقع پر اشعار نظم کرتے تھے، تاکہ درباری گویّے انھیں گائیں۔ ان نظموں کو درباری موسیقی دانوں
اور شاعروں نے مختلف موقعوں پر جمع کیا ہے، اس بنا پر کتاب نورس کی تاریخ تدوین کے سلسلہ کی
ساری بحث بیکار ہے، چاند سلطانہ (اس کی چچی) یا چاند بی بی (اس کی بیوی اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن)
کا ذکر تاریخ تدوین کے ضمن میں بالکل غیر ضروری اور گمراہ کن ہے، ممکن ہے ابراہیم نے ایک نظم لکھی ہو جب
چاند سلطانہ زندہ رہی ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمام نظمیں اس کی حیات کے دوران ہی میں
مرتب ہوئیں، اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نورس ابراہیم عادلشاہ کے اشعار کی بیاض ہے، یہ اشعار
اس کے آخری ۴۱ سال[2] کے دوران میں مختلف موقعوں پر جمع اور مدون ہوئے، متن کا اختلاف
اس وجہ سے ہے کہ مختلف شاہی خطاطوں نے مختلف موقعوں پر اس کی تدوین کی۔ اسی بنا پر دوہوں
کی تعداد اور بعض اوقات لفظوں کے تلفظ اور ہجا میں بھی فرق ہو گیا ہے۔

۱۱۔ دکن کی تاریخ، رسوم، تہذیب اور زبان کے بارے میں مرتب کا علم ادھورا معلوم ہوتا ہے، عادلشاہی
اور قطب شاہی خاندانوں کے سلاطین مغل بادشاہوں کی طرح تخت نشینی کے بعد نیا نام یا لقب اپنے لیے

[1] گویا ہر شاعر ایک ہی موقع پر دیوان کی ساری نظمیں لکھ ڈالتا ہے (ن) [2] ابراہیم عادلشاہ کی وفات ۱۰۳۷ھ میں
ہوئی، اس حساب سے نورس کے اشعار کی تصنیف ۹۹۶ھ سے شروع ہوئی، کیا ڈاکٹر زور اس تاریخ کے تعین کی کوئی وجہ بتا سکتے ہیں؟

تجویز نہیں کرتے تھے، بلکہ عموماً وہ خاندانی نام اپنے نام کے بعد اضافہ کرلیا کرتے تھے، مثلاً بیجاپور کے ابراہیم اور محمد، ابراہیم عادلشاہ اور محمد عادلشاہ اور گول کنڈہ کے اسی نام کے سلاطین ابراہیم قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کہلاتے تھے، لیکن نورس کے مرتب کا خیال یہ ہے کہ ان کا نام ابراہیم عادل اور محمد عادل تھا، چنانچہ ان کو ایسا ہی لکھتے ہیں (ص ۱۴۴)

۱۲۔ مرتب کی محنت کو سراہتے ہوئے یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ "کتاب پر نظر ثانی اور جن غلطیوں کی طرف اشارہ ہوا ہے ان کی صحت کرلی جائے۔ غالباً اس کا ترجمہ ہندی اور اردو میں ہونے والا ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ تصحیح شدہ متن کا ترجمہ ہو، سید محی الدین قادری زور۔"

ہر پارہ کے متعلق میرے معروضات ذیل میں درج ہیں:۔

۱۔ اکبر کی فتح گجرات کے موقع پر وہاں کے فضلا کے بیجاپور بلائے جانے اور ان کی وجہ سے بیجاپور کی زبان گجری ہونے کا ذکر صرف اسی پارہ میں نہیں ہے، بلکہ آج سے ۲۶ سال قبل "اردو شہ پارے"[1] میں بھی اس طرح ملتا ہے:

"ابراہیم عادل شاہ نے اردو زبان کی جو سب سے اعلیٰ خدمت انجام دی ہے اور جس کی وجہ سے اس کا نام اردو کے محسنوں کی فہرست میں سب سے اول آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے گجراتی شاعروں اور عالموں کو بیجاپور میں آبسنے کی دعوت دی۔"

اس کے بعد ڈاکٹر زور نے اس کتاب میں اردو کی نشو و نما کے اسباب بتائے ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر کے حملے نے اس بساط کو الٹ دیا، جس کے نتیجے میں وہاں کے علما، و شعرا، پریشان ہوگئے،

"ایسے نازک موقع پر ابراہیم نے نہایت عقلمندی اور فیاضی کا کام کیا، اس نے اپنے آدمیوں کو بیش بہا تحائف دیکر گجرات روانہ کیا تاکہ وہاں کے علما، و شعرا کو اپنے یہاں

[1] ص ۳۵



آنے کی دعوت دیں، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد گجرات کے ادبی عظمت کے پرچم کو بیجاپور میں لہراتا ہوا دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ان گجراتیوں کا اثر یہ ہوا کہ بعض دکھنی مصنفین بھی گجراتی آمیز زبان کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے۔"

اس سلسلے میں ذیل کے معروضات قابل توجہ ہیں:

(ا) گجرات کی حکومت کا زوال ۹۸۰ھ میں اکبری عہد کے ۱۸ ویں سال[1] رونما ہوا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ابراہیم عادلشاہ سے جو ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا ثابت نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف بھی زوال حکومت گجرات اور بادشاہ مذکور کی تخت نشینی میں ۸ سال کا وقفہ بتاتے ہیں،[2] اس لیے جس حملے کا ذکر ڈاکٹر زور نے کیا ہے وہ سوائے ۹۸۰ھ کے حملے کے اور کوئی دوسرا حملہ مراد نہیں ہے، چونکہ یہ ابراہیم کی تخت نشینی سے پہلے کا واقعہ ہے، ایسی حالت میں ان کا قیاس بالکل بے بنیاد ہوجاتا ہے۔ البتہ اتنا واقعہ ہے کہ ابراہیم کے وکیل سلطنت دلاور خاں نے اپنے زمانۂ وکالت (۹۹۰ھ۔ ۹۹۸ھ) میں نہ صرف گجرات کے علماء کو بیجاپور میں بسنے کی دعوت دی بلکہ لاہور اور دوسرے مقامات سے بھی بلوایا تھا، مگر بساتین السلاطین کے ذیل کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علمائے مذہبی تھے[3].

"دلاور خاں بعضے از علمائے گجرات و لاہور وغیرہ را در سلک مجلسیان جمع نمودہ بود و با ایشان صحبت میداشت و تحقیق مسائل فقہی میکرد و ایں جماعت تمام روز در دولتخانۂ او بہ مطالعہ و مذاکرۂ تفاسیر و حدیث و فقہ اشتغال می داشتند۔"

(ب) اگرچہ اس عبارت اور اردو شہ پارے دونوں جگہ بیان یہ ہوا ہے کہ گجرات کا ادبی پرچم بیجاپور میں لہرا رہا تھا، لیکن اردو شہ پارے میں عہد ابراہیم کے علما، و شعرا کی جو فہرست دی ہے

[1] اکبر نامہ ج ۳ ص ۳۲، حراست آں سرزمین بخان اعظم مرزا کوکہ تفویض یافت، مرزا کوکہ کی علم دوستی سے بعید نہیں کہ وہاں کے اکثر علما اسکے سایۂ عاطفت میں آگئے ہوں (ن) [2] اردو شہ پارے ص ۳۵۳-۳۵۴ [3] بساتین السلاطین ذیل حالات ابراہیم

ان میں سے کسی کا تعلق گجرات سے نہ تھا۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

"بڑے بڑے شعراء اور مصنفین جن میں ملا ظہوری، ملا باقر، ملک قمی، عبد القادر نورسی شامل ہیں، اس کے دربار میں موجود تھے، علما میں رشید الستگی، مولانا حیدر ذہنی، مرزا مقیم اور آتشی کے نام قابل ذکر ہیں۔"

اس فہرست میں ظہوری قائن کا، باقر کاشان کا، ملک قم کا، نورسی قزوین کا، حیدر ذہنی کاشان کا، مقیم استرآباد کا اور آتشی شیراز کا تھا، یہ سارے مقام ایران میں ہیں اور یہ سب شاعر ایران سے ہندوستان آئے، ان میں سے بیشتر پہلے احمد نگر آئے، پھر بیجاپور گئے۔ ان کے علاوہ اس عہد کی چند مشہور شخصیتوں کا حال اس طرح ہے:-

محمد قاسم فرشتہ استرآبادی احمد نگر سے بیجاپور گیا، رفیع الدین شیرازی ۵۰ سال سے بیجاپور ہی میں تھا، سنجر کاشی مدتوں شمالی ہندوستان میں رہا، پھر گجرات میں ایک سال قید رہا اور ۱۰۱۲ھ کے قریب بیجاپور پہنچا، کلیم کاشانی بھی بیجاپور میں تھا، اور شمالی ہندوستان سے سنجر کے بہت بعد بیجاپور پہنچا تھا، شاہ نواز خاں شیرازی ۹۸۸ھ کے قبل ہندوستان آیا اور یہاں کے زیادہ حصوں کی سیاحت کرکے شیراز واپس چلا گیا، دوبارہ ۹۹۶ھ میں براہ دریا تکیبی اصفہانی کے ساتھ بیجاپور آیا، عبدل شمالی ہند سے بیجاپور گیا

غرض کہ عہد ابراہیمی کی بیشتر ممتاز شخصیتیں ایران سے آئیں، اور بعض احمد نگر میں مقیم رہ چکنے کے بعد وارد بیجاپور ہوئیں، اس لیے ڈاکٹر زور کے بیان میں وزن باقی نہیں رہ جاتا،

(ج) ڈاکٹر زور نے جس گجری زبان کا یہاں ذکر کیا ہے، اس کے متعلق اردو شہ پارے میں بھی لکھا ہے کہ اس کا ظہور حکومت گجرات کے زوال کے بعد یعنی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دوران حکومت میں ہوا اور اپنے قیاس کی تائید میں برہان الدین جانم کی مثال پیش کی ہے جو اپنی زبان کو گجری کہتا تھا،

---

۱؎ اردو شہ پارے ص ۴۴۴



شاہ مذکور کی وفات ۹۹۰ھ میں یعنی عہد ابراہیمی کے ابتدائی دو سال کے اندر ہی ہو چکی تھی، اس لیے اس کو خاتمہ حکومت گجرات کے بعد کے گجراتی مہاجرین سے ملنے کا اتفاق ہی نہ ہوا ہوگا، کیونکہ یہ حکومت ۹۸۰ھ کے بعد مغلیہ سلطنت میں ضم ہو گئی تھی، غرض ڈاکٹر زور کے بیان میں جس حملے کا ذکر ہے اس سے خواہ ۹۸۰ھ کا پہلا حملہ مراد لیا جائے، خواہ وہ حملہ جس کے بعد گجرات سلطنت مغلیہ میں شامل ہوا دونوں حالتوں میں ان کا بیان غلط ہو جاتا ہے۔

پہلے پارہ کے شروع ہی میں یہ صریح غلطی ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کی مدت سلطنت ۵۹ سال دی ہوئی ہے، حالانکہ اس کے ساتھ ہی تخت نشینی کا سنہ ۹۸۸ھ اور وفات کا ۱۰۳۶ھ بھی موجود ہے۔

۲- دوسرے پارہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کتاب نورس کی زبان دکھنی ہے نہ گجری بلکہ ایک مخلوط زبان ہے جو ہندوستان بھر میں موسیقی کے لیے رائج تھی،

یہ پورا خیال غلط اور بے بنیاد ہے، نورس کے بغور مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان شروع سے آخر تک یکساں نہیں ہے، کچھ گیت ایسے ہیں جو سنسکرت کے الفاظ و مصطلحات سے پر ہیں اس لیے وہ مشکل ہو گئے ہیں، کچھ ایسے ہیں جن میں یہ عنصر نسبتاً کم ہے، اور بعض ایسے گیت ہیں جو صاف اور رواں ہیں، صاف اور سادہ گیت کی زبان اس وقت کی مروجہ دکھنی کا نمونہ قرار پا سکتی ہے۔

اس زبان میں اور اس وقت کی دکھنی کتابوں کی زبان میں بہت کم فرق ملے گا، اس اعتبار سے یہ خیال کہ نورس کی ایک مخصوص زبان تھی اور وہی زبان سارے ہندوستان میں رائج تھی صحیح نہیں، جو گیت صاف اور رواں ہیں وہ مغلق گیتوں سے اتنے مختلف ہیں کہ اگر وہ الگ الگ کر دیے جائیں تو ان کا ایک ہی کتاب کا جزء اور ایک ہی مصنف کا کلام ہونے میں شبہہ ہوگا۔ موضوع کے اعتبار سے ان دو طرح کے گیتوں میں فرق ہے، سادہ گیتوں میں یا تو حضرت سید گیسو دراز سے عقیدت کا اظہار ہے، یا کسی خانگی بات کا بیان ہے یا عاشقانہ خیالات کا اظہار ہوا ہے، ان میں ہندو دیومالا

ساز کر شکل ہی سے ہوا ہے، میں نے نورس کے مقدمہ[1] اور تحقیقی مطالعے[2] کے ایک مقالے میں اسی خیال کا اظہار کیا تھا، اور مثالیں پیش کی تھیں، مثلاً ملاحظہ ہو:

"اشعار میں عربی و فارسی الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں لیکن بیشتر جگہوں پر سنسکرت کے الفاظ یا تو اصل شکل میں یا ترمیم شدہ حالت میں اس طرح پائے جاتے ہیں کہ اگر دونوں قسم کے اشعار الگ الگ لکھ دیے جائیں تو کوئی شخص یہ قیاس نہیں کر سکتا کہ یہ ایک ہی کتاب کے اجزا اور ایک ہی مصنف کے کلام ہیں"

آسان گیتوں کی مثالیں:-

سید محمد مرے دلپہ نانو جیون رسول کر لکھے عرش ٹھانو

مخدوم سید محمد حسینی گیسو دراز عاشق شہباز سر فراز

تمھاری قبر سینی سید محمد آچھے موتی

ابراہیم پکڑیا ہے آس جب آوے سید محمد کی باس

تب ہووے گا الاس

جیون تارے چاند کو جیپیں اجیت نکلیا سب چھپیں

تیوں سب پر غالب سید محمد آہیں

بیگ ملاری پیارے سبحان ناہھاوے سکھ منج آن پان

ابراہیم برسے موتی خاں

پیارے پیارے ایک پاس ہاں جیوں بول تھیں بچھڑ کر پھول باس

کتنا دیکھوں یو مکھ ان نینوں تھیں سب ہوئی چوک

دندیں دیویں دل پہ داغ دکھ

---

[1] لہ ص ۲۸ [2] کہ ص ۵۵-۵۶



جل بن جیوں تملی مین گھڑی ایک منج جاوی دین

ابراہیم چکور چاند مین

ایک نار دیکھیا کھڑی سامنے پونم رات کی مکہ چاندنی

یا جھمکے میگہ رت سودامنی

جناری چتر نکے ہوئے مانی جیوں موج پر موج آمے پانی

بولے باتاں شیرین زبانی

اب ذرا سنسکرت آمیز گیتوں کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

بھیروکر پور گورا بھال تالک چندرا تری نیترا جٹا مکٹ گنگا دھرا

ایک ہست رنڈ نزا ترسول جگل کرا باہن بلیوردسیت جات گسائیں ایسورا

گنپتی تم روپ کی تنک جوت مانو سور جگمگے رت بسنت

سودیشٹ ساوشٹ بھئی ونایک منوہر سن مکہ دیکھن کیٹھن ساوک نین پنت

پرتھم سپر بھات کی سوتری بیار مانو روہی اروہی ساس نورس کو

باری باری پھپ ہست اڑگن پر بیکھ دبے تم آچھے چھب ہو

سپت اڑگن سپت کھن کی دیپک نہچیں کر اور سرو تحھر بھئی آرتی نیچھاور

کلیانی رمنی پیور کچا تنودری مرگ نینی باہاں تنوی سیام کیس بدن ہمکر

کانتا نکم وسنتی بالی تجاڈر ڈرشا پشنتی رداولی نیلی کنچکی چتر وستر

اس قسم کے گیتوں میں بعض جگہ فعل بھی سنسکرت ہی کا آگیا ہے، اب دو ایک مثالیں ایسے گیتوں کی ملاحظہ کر لیجیے جن میں اتنا اشکال نہیں ہے:-

جگ سکھ نت انند بھئے جون سدا جنم گھوئی برہی کاج اے برہی مو بچتر مو من لاگے پل پل کوٹ باج

اے پون نجان پرجن برہے کٹھن اگن بھاگ ہوں جلون کچھ ڈر نہیں منہج ڈر جگ جل جائے س اگ

چتر چتاری چتر چیتاری گگن کا گت سوم مہرا دتیاری

سور گنگ جل گھول سنوارے پھر چیت کے لکھنی لکھنہارے

ٹکے دھرے جھکے سادسارے

ایسے حالات میں کتاب نورس کی کوئی مخصوص زبان قرار دینا اور پھر اسے سارے ہندوستان کی موسیقی کی زبان ٹھہرانا عجیب معلوم ہوتا ہے، کیا ڈاکٹر صاحب کسی ایک کتاب کا پتہ بتائینگے جس کی زبان نورس کے مشابہ ہو۔

۳-۴۔ تیسرے اور چوتھے پارہ میں یہ شکایت ہو کہ میں نے ابراہیم عادلشاہ کے تفصیلی حالات جمع نہیں کیے، اس کے لیے میری معروضات یہ ہیں، (ا) میں ایک کتاب کی تدوین کر رہا تھا، کسی شخص پر مقالہ نہیں لکھ رہا تھا،

(ب) مقدمہ کتاب میں کتاب کے سارے پہلوؤں کو نمایاں کرنا زیادہ ضروری تھا، اگرچہ اس سے بھی صرف نظر ہو سکتا تھا، لیکن اس کتاب کی زبان بہت مشکل تھی، اس لیے میں نے ناظرین کی آسانی کے خیال سے اس مختصر سی کتاب پر (جس کا متن ۵۰ صفحہ کا ہے) ۶۲ صفحہ کا مقدمہ، ۲۹ صفحہ کا ترجمہ، ۹ صفحہ پر تلمیحات اور ۱۸ صفحہ کی فرہنگ کا اضافہ کیا، اگر اتنا بھی ناکافی ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔

(ج) یہ کتاب میں نے خود طبع کرائی ہے، خواہ مخواہ کے صفحے بڑھانے سے مصارف زیادہ ہو جاتے جن کا میں متکفل نہ ہو سکتا تھا۔

(د) ابراہیم عادلشاہ کی شخصیت کوئی غیر معروف شخصیت نہیں تھی، اس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اس لیے اس کتاب میں اس کے حالات کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔

تیسرے پارہ کی ابتدا میں بتایا ہے کہ میں نے دس نسخوں کی مدد سے نورس کا متن مرتب کیا ہے، اس میں دس کے بجائے نو ہی ہونا چاہیے، میں ہر جگہ "نو" ہی تعداد لکھی ہے، اور ان نو نسخوں کا تعارف بھی کرا دیا ہے، معلوم نہیں ڈاکٹر نے ایک نسخہ کا اضافہ کیوں کر دیا،

(باقی)



# شیخ الاسلام مولانا حسین معز شمس بلخی نوشہ توحید

از مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی

شیخ الاسلام مولانا حسین معز شمس بلخی المعروف بہ نوشہ توحید وسمندر توحید علوم و معارف میں یگانۂ روزگار، سلوک و تصوف میں ممتاز اور شریعت و طریقت و حقیقت و معرفت حقیقت و مجاز، ظاہر و باطن میں ایک جامع و باکمال بزرگ ہیں، آپ کے مکتوبات و رسائل، علمی و عملی تصوف و سلوک کے اسرار و رموز اور کتاب و سنت کے بصائر و حکم سے معمور ہیں، آپ نے آٹھویں صدی ہجری کے ہند و حجاز کے اکابر علماء سے علوم و معارف کا درس لیا، اور اس دور کے مشاہیر مشائخ و صوفیہ سے فیض باطن حاصل کیا، "مولانا مظفر شمس بلخی اور سند حدیث" کے عنوان سے معارف بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۲ء و اکتوبر ۱۹۵۲ء میں آپ کا مختصر ذکر آ چکا ہے، اب ان کے مفصل حالات پیش کیے جاتے ہیں،

**نام و نسب اور ولادت و مولد** حسین معز شمس نام، نوشہ توحید و سمندر توحید لقب، سلطان شمس الدین[1] بلخی کے تین نامور صاحبزادے مولانا مظفر شمس بلخی، مولانا معز شمس بلخی، مولانا قمر الدین شمس بلخی تھے، مولانا موصوف مولانا مظفر شمس بلخی کے برادر زادہ اور متبنیٰ اور مولانا معز الدین شمس بلخی کے صاحبزادے ہیں، سلطان موصوف نے جب قیام بہار کے بعد اہل و عیال کو طلب کیا تو وہ دہلی سے ترکِ سکونت کر کے ظفر آباد میں آ کر مقیم ہوئے، اور بروایت صاحب رسالہ شیخ بہرام بہاری اور مونس القلوب مولانا مظفر شمس بلخی حسب طلب پدر بزرگوار، خود ترک ریاست اور ترک وطن کر کے، براہ راست بلخ سے

[1] رسالہ کاشف الاسرار و مناقب الاصفیاء،

ہندوستان پہنچے، اور پہلے دہلی اس کے بعد ظفرآباد میں مقیم ہوئے، اور وہاں سے بہار پہنچے، قیام ظفرآباد[1] میں نوشۂ توحید کی ولادت آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں کسی غیر معین سنہ میں ہوئی، ابھی نومولود کی خبر ابھی بہار پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ حضرت مخدوم جہاں نے مولانا مظفر بلخی کو بلا کیا دی کہ فرزند مبارک ہو، آپ نے عرض کی حضرت میں تو ابھی متاہل بھی نہیں ہوں، اولاد کیوں کر ہو گئی، فرمایا مولانا معز بلخی کے گھر میں فرزند تولد ہوا ہے، وہ تمھاری ہی فرزندی سے مشہور انام ہو گا[2]، اور اپنا پیراہن مبارک، اور ایک رومال عطا کیا کہ جب لڑکے کو کپڑے کی ضرورت ہو گی تو اسی پیراہن سے بنانا اور رومال کی ٹوپی بنوا کر چھٹی میں پہنانا، چنانچہ مولانا مظفر بلخی ہی کے فرزندی سے آپ نامزد اور مشہور خلائق ہوئے،

شیخ الاسلام مولانا مظفر شمس بلخی معقولات کے ایک مسلّم الثبوت استاد تھے، سلطان فیروز شاہ[3] کے عہد حکومت میں درس گاہ فیروز شاہی میں مدرس اعلیٰ تھے[4] اور قیام مکہ مکرمہ کے زمانے میں حرم شریف میں[5] صحیحین کا درس دیا کرتے تھے، ان ہی بزرگ کے مکتب درس میں آپ نے بسم اللہ پڑھی اور سفر و حضر میں ساتھ رہ کر تربیت و تعلیم حاصل کی، آپ کے علاوہ دیگر مشاہیر علماء و فضلائے عصر سے بھی درس لیا، قیام مکہ معظمہ کے زمانہ میں اگر ایک طرف مولانا موصوف سے احادیث کا درس لیتے تھے تو دوسری طرف شیخ شمس الدین خوارزمی[6] اور شیخ شمس الدین حلوائی سے قرأت سبعہ اور معارف القرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے قیام عدن کے زمانہ میں خطیب عدن[7] سے بھی حدیث[8] کی سند حاصل کی، آپ کو مولانا سعد الدین[9] مفتی جونپوری سے بھی تلمذ حاصل ہے۔ کسی مسئلہ میں مفتی صاحب سے اور آپ سے اختلاف ہو گیا تھا رفع اختلاف کے لئے آپ جونپور پہونچے، مگر مفتی صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی تو آپ نے ایک مکتوب ارسال کیا جس سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے[10]۔

---

[1] مناقب الاصفیا و دوسیلۂ شرف [2] وسیلۂ شرف [3] مناقب الاصفیا و مونس القلوب [4] مسند حدیث [5] سند حدیث در رسالہ گوہر شاہ [6] مخطوطہ [7] سند حدیث [8] مکتوب حسین معز شمس بلخی مکتوب بست و سوم۔



"بحکم اخلاص عرضداشتہ شد تکلفے و عبارتے نمی کنم شاگرد قدیم عوض مصالح امروز شاگرد ان شنیع ست
اگر چہ کہ جرأت رائلم در عفو گشند"

<table>
<tr><td>سند حدیث</td><td>الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی محمد سید البشر رسول اللہ وآلہ اجمعین[1]</td></tr>
</table>

اما بعد، فقیر حقیر مظفر شمس عامہ مسلمانان را اسلام و دعا می رساند و باز نماید، فقیہ حسین معز شمس برادر زادہ ایں فقیر است حق سبحانہ و تعالیٰ ویرا گرامی کردہ فرزند صالح و متقی است، قریب چہار سال[2] در مکہ مبارک بود قرأت قرآن و شاطبی پیش شمس الدین خوارزمی درون کعبہ کردہ، قرأت سبعہ پیش شمس الدین حلوائی در مقام ابراہیم پیش در کعبہ گذشتہ و شیخ شمس الدین مذکور در عصر خود یگانہ روزگار است، در حلب و شام و مصر و مدینہ مصطفےٰ و مبارک در علم قرأت ویرا نظیرے نیست و جائے شیخ مجاور حرم است. فرزند حسین مذکور سند حدیث بریں فقیر کردہ صحیح مسلم و صحیح بخاری من اولہ و آخرہ لفظاً و معناً بریں فقیر تحقیق کردہ خداے تعالیٰ ویرا ذہن صافی و طبیعت فیاض دادہ است و سند دیگر بر خطیب عدن نیز کردہ است از جہت ایں فقیر او را در تدریس ایں علم مجاز است، خدا تعالیٰ او را نافع مسلمانان گرداند در دین ایشان و در دنیا ایشان، آمین

<table>
<tr><td>درس و تدریس</td><td>ارشاد و ہدایت کے ساتھ آپ کا مشغلہ آخر حیات تک درس و تدریس تھا، اکثر و</td></tr>
</table>

بیشتر تفسیر و احادیث کا درس دیتے تھے، چنانچہ فرزند عزیز حسن بلخی کو نحو و ادب اور فقہ اور کلام کے تحصیل کی تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"و بعدہ کار فقیر خود ہمی اشتغال بہ تفسیر و احادیث است کہ خدا چہ گفت و رسول چہ کرد[2]: بریں کار غفلت نہ کنید بدانچہ تواند جہد بلیغ کردہ دست آرد ما خود منتظریم اگر ایں قدر شدہ حق پدری بر دا شتہ کنم،"

آخر وقت میں اپنے پوتے احمد بلخی لنگر دریا ابن حسن بلخی کو بھی عقائد کی کتابیں پڑھائیں، اور فرماتے تھے

---

[1] بعض دیگر نسخوں میں علوائی مکتوب ہے [2] از مکتوبات مکتوب نو دہم در علو ہمت بنام فرزند حسن طال عمرہ [3] مونس القلوب و وسیلۂ شہرت،

ہیں کہ آپ نے اپنی علالت کی حالت میں عقائدِ نسفی مع شرح مظفری مجھ سے تمام کرائی ہے، آپ کے حلقۂ درس سے بیرونِ بہار کے طلبہ بھی فیضیاب ہوتے تھے، چنانچہ مولانا موسیٰ[1] بنارسی ابن شیخ المشائخ حضرت مولانا عزیز اللہ بنارسی یمنی جو حضرت چراغ ہند دہلوی اور شیخ بدیع الدین مدار کے ہمعصر تھے، آپ کے درس گاہ دار المعارف میں پہنچے، اور یہاں قیام کرکے معارف و علوم حاصل کیے، علوم ظاہری کے ساتھ علم باطن بھی آپ ہی سے حاصل کیا، اور آپ کے مرید اور مجاز و خرقۂ خلافت سے سرفراز ہو کر گھر واپس ہوئے، آپکے مشہور تلامذہ میں سے ایک بزرگ مولانا شیخ مبارک[2] تھے، جو مولانا خواجہ محمد علیٰ جونپوری کے مرید اور ایک روشن ضمیر بزرگ تھے، آپکے حلقۂ درس میں علوم قرآن کا درس لیا کرتے تھے، اور آپ ان کی صلاحیت قلبی کی تعریف کیا کرتے تھے، غرض آپ تفسیر و حدیث، عقائد اور علم کلام وغیرہ جملہ علوم کا درس دیتے تھے۔

ارادت و اجازت
بیعت و خلافت

آپکو حضرت مخدوم جہاں رحمۃ اللہ علیہ سے بلا واسطہ بیعت و ارادت اور مخدوم جہاں اور مولانا مظفر شمس بلخی دونوں سے خلافت و اجازت حاصل تھی، صاحب کاشف الاسرار لکھتے ہیں کہ "مولانا شیخ حسین دست گرفتہ و تربیت یافتہ حضرت مخدوم الملک است و اجازت و خلافت ہم از جناب ایشان و ہم از مولانا مظفر دارد"، اور نیز مناقب الاصفیا تحریر فرماتے ہیں کہ "چوں او (مولانا مظفر) را سفر آخرت قریب رسید و علالت غلبہ کرد حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین برادر زادہ خود را آثار رحمت و انواع نعمت خود و پیران عطا فرمود و وداع کرد"۔

مولانا مظفر بلخی نے اپنے دست مبارک سے یہ اجازت نامہ عطا فرمایا،

اجازت نامہ

"فقیہ حسین مذکور مرید بندگی شیخ الاسلام والمسلمین مخدوم شرف الحق والدین احمد یحییٰ منیری است قدس سرہ العزیز از جہت ایں فقیر توبہ دادن مسلمانان و بیعت کنانیدن و مقراض راندن مجاز است تا معلوم عزیزاں باشد عاقبت او و ہمہ مسلمانان بخیر باد، آمین

[1] از رسالہ گوہرستان مولفہ مولانا بنارسی [2] رسالہ گوہرستان مخطوطہ



ان شواہد کے پیش نظر حضرت مولانا عبد الحق محدث دہلویؒ کی تحریر کہ "شیخ حسین بن معز بلخی آنچہ مشہور است او مرید و خلیفہ شیخ مظفر کہ عم حقیقی اوست می دانند اما از اوراق کلام او چناں ظاہر می شود کہ او پیوند ارادت بہ شیخ شرف الدین قدس سرہ دارد و تربیت و ارشاد و خلافت از شیخ مظفر یافتہ" غیر مستند ہے۔
اس کے علاوہ خود مولانا حسین معز بلخی دیوان[1] میں لکھتے ہیں کہ "مقتدائے دین پیرم منیری" اور فرماتے ہیں کہ

تعلیم اللہ بطفیل شرف الحق امروز — بر طارم گردوں معلا زدہ ام

اس لیے آپ مرید ایک کے اور مجاز دونوں بزرگوں کے ہیں،

پیران طریقت اور شیوخ شجرہ

پیران طریقت اور شیوخ کا سلسلہ تو وہی ہے، جو مولانا مظفر بلخی کا ہے اور ان کا ذکر مولانا مذکور کے تذکرہ میں آچکا ہے، اور آپ کے نسب کا سلسلہ جس طرح حضرت امام حسین ابن علی رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، اسی طرح شیوخ کا سلسلہ بھی اسی نقطہ ولایت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے

روحانی تربیت

آپ کی تربیت روحانی شروع ہی سے مخدوم الملک اور مولانا مظفر بلخی کی صحبت میں ہوئی، چنانچہ لکھتے ہیں کہ "بحمد اللہ از روس بندگی مخدوم من دانم کسے نہ داند کہ مدت چہل سال ملازم خدمت و صحبت بودم دیگراں دور شدہ چیزے بالا بالا دیدہ اند من نیکو دانم کہ مخدوم را چہ معاملہ بود دیگرے چہ داند"۔ ایک دوسرے مکتوب[5] میں لکھتے ہیں کہ "مدت چہل سال باز برابر رکاب بندگی مخدوم مرحوم بود چنانچہ در سفر و حضر از رکاب جدا نگشتہ از امور دارین اہم مہم دریافتہ"۔
صاحب کاشف الاسرار لکھتے ہیں کہ "از بدو شعور زیادہ تر ملازم صحبت مولانا و زیر تعلیم و تربیتش سرفرازی بود و بظل شفقت و سایہ عاطفتش زندگانی می نمود" گنج لا یخفیٰ کے مجالس کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اکثر و بیشتر مجالس مذاکرہ اور حضرت مخدوم کی صحبت میں رہے اور مخدوم کے ملفوظات کو تحریر

[1] دیوان فارسی قطعات [2] دیوان غزلیات [3] از شجرۂ طریقت و شجرۂ نسب مطبوعہ [4] از مکتوبات مکتوب نود و ششم بنام مولانا بہاء الدین [5] مکتوبات ہ و ہم بنام صدر الائمہ قمر الدین

کرتے تھے، چنانچہ مجالس مذکور کا ایک عنوان ہے کہ "روز جمعہ دولت پابوس میسر شد نیز روز سہ شنبہ بچارہ پیش بود، شب دولت پابوس میسر شد اور شنبہ بچارہ بسعادت پابوس رسید چناں و چنیں"، خود حضرت مخدوم[1] فرماتے ہیں کہ "مولانا مظفر ہم اور تم مشقت اٹھاتے ہیں لیکن مزا میاں حسین اٹھائیں گے" اور نیز فرماتے ہیں کہ "میں نے تنور گرم کیا اور مظفر نے روٹی پکائی اور حسین کھائیں گے" لہٰذا دولت روحانی اور علوم باطنی کا حصول ان ہی حضرات کی صحبت کا فیض ہے،

**بصیرت علمی و مرتبہ روحانی**

علوم معقولات و منقولات حقیقت و مجاز شریعت و طریقت ظاہر و باطن اور علم اسرار کے جامع تھے، فن میں آپ کو دستگاہ کامل حاصل تھی، منقولات علوم قرآن اور حدیث دانی کی شہادت: اوراد دہ فصلی اور مکتوبات سے ملتی ہے، معقولات فلسفہ و کلام و منطق کی شہادت رسائل توحید اور رسالہ قضا و قدر سے، شریعت و طریقت و حقیقت و معرفت علم باطن کی شہادت مضامین رسائل اور مکتوبات سے ملتی ہے۔

مرتب رسائل توحید سلطان الموحدین تاج العارفین قطب الاقطاب مخدوم شیخ حسین نوشۂ توحید قدس سرہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں، صاحب گوہر ستانی لکھتے ہیں "شیخ حسین معز شمس بلخی مقتدائے وقت بود و پیشوائے ارباب توحید در روزگار بنوشۂ توحید زبان زد است و شیخ بدیع الدین مادر مدار او را بنوشۂ توحید خوانده" صاحب کاشف الاسرار تحریر کرتے ہیں "آں یکہ تاز میدان تجرید و تفرید آں شاہباز پرواز فضائے توحید مخدوم شیخ حسین معز بلخی الملقب بہ نوشۂ توحید و سمندر توحید صاحب مقامات عالیہ و بیانات شافیہ است و کمالات متکاثرہ و کرامات باہرہ دارد" صاحب مناقب الاصفیا: "شیخ الاسلام و نوشۂ توحید" سے اور صاحب وسیلۂ شرف[2] "نوشۂ توحید و سمندر" لکھتے ہیں، غرض ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور بصیرت کے اعتبار سے

---

[2] وسیلۂ شرف



ایک خاص لقب سے ملقب کیا ہے،

**تصنیف و تالیف**

ارشاد و ہدایت، تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا ذوق بھی تھا، عربی و فارسی میں کئی تصنیفات آپ کی یادگار ہیں، حضرات خمس عربی، رسالہ قضا و قدر فارسی، رسالہ توحید خاص فارسی، رسالہ توحید اخص الخواص فارسی، رسالہ ذکر وجود اول بدایت آں و بیان معرفت عالم و نہایت آں فارسی، رسالہ در بیان ہشت چیز ذات و جہت و نفس و صفت و اسماء و افعال و صورت جامعہ و صورت متفرقہ بسبیل توضیح و تشریح بر اصطلاح موحداں فارسی، اوراد دہ فصلی عربی و فارسی، گنج لایخفیٰ فارسی، مکتوبات فارسی، اجازت نامہ بنام مولانا شیخ حسن بلخی، دیوان فارسی،

**حضرات خمس**۔ چند صفحہ کا ایک عربی رسالہ ہے، اس میں تجلیات باری تعالیٰ عز اسمہ کی پانچ صورتیں متعین کر کے ان کی توضیح کی ہے، اول احدیت حق تعالیٰ بالفعل اور بالقوہ باعتبار ذات و صفات کے یکتا و یگانہ و لاشریک ہے، دوم حضرت المحبوبیۃ بصفت محبوبیت ہر شے میں وہی متجلی و ظاہر ہے، سوم جو شخص جس شے کا محب ہے، وہ بصفت محبوبیت اسی کے تجلی کی ایک صورت ہے، چہارم خلق کو ترک و عصیان سے توجہ و اطاعت کی طرف دعوت دینا اسی کی تجلی کی ایک صورت ہے، لہٰذا انبیاء و رسل اور خلفاء دعوت الی الحق کے مظاہر ہیں، پنجم اضلال و اغوا شیطان کی صفت ہے، لہٰذا نفس انسانی بصفت شیطانیت اسی کی تجلی خفی کی ایک صورت ہے یعنی بصورت نفس وہی مضل و مغوی ہے، جس طرح بصورت نبوت و رسالت و خلافت بصفت ہدایت متجلی ہے[1]، اس رسالہ کی شرح ایک صاحب زادہ مولانا شیخ حسن بلخی نے فارسی میں کی ہے، جو کاشف الاسرار کے نام سے موسوم ہے، یہ شرح طبع ہو چکی ہے، کہا جاتا ہے، رسالہ مذکور معاصر علماء حجاز نے پڑھا اور پڑھ کر تحسین فرمائی،

**رسالہ قضا و قدر**۔ رسالہ قضا و قدر مسئلہ قضا و قدر میں چند ورق کا رسالہ ہے اور مخطوط ہے، قضا

---

[1] معارف: یہ اسرار و رموز ہم جیسے ظاہر بینوں کی فہم سے باہر ہیں،

اور قدر کے اسرار و حکم اور خیر و شر کے رموز پانچ تمہیدات میں بسط و شرح سے بیان کیے ہیں، آیات قرآنی
قل کل من عند اللہ وما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک دو
دونوں آیات میں بظاہر جو تضاد ہے اور جس کو نہ سمجھنے کی بنا پر مذاہب باطلہ قدریہ جبریہ و ثنویہ پیدا ہو گئے
ان کا دل نشین پیرایہ اور مدلل طریقہ پر رد کیا گیا ہے، اور مسئلہ خاص میں اہل سنت والجماعت کے مسلک
حق کو آیات "وھو خالق کل شیٔ" اور "اللہ خلقکم وما تعملون" کی تفسیر سے مدلل طریقہ پر ثابت کیا گیا
مسئلہ مذکور پانچ تمہید میں بعنوانات ذیل بیان کیا گیا ہے۔

التمہید الاول فی بیان حقیقۃ الخیر والشر، التمہید الثانی فی بیان الحکمۃ فی خلق الشر، التمہید الثالث
فی بیان اخراج الشر عن حد الرضا، التمہید الرابع فی بیان اختیار العبد وافعالہ، التمہید الخامس فی بیان
حکمۃ الانقیاد۔ یہ رسالہ مسئلہ قضا و قدر پر بصیرت افروز مقالہ ہے، جو کسی سائل کے سوال پر تحریر کیا گیا ہے۔

**رسالہ توحید خاص۔** یہ رسالہ بھی کسی سائل کے سوال پر تحریر کیا گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ "آنچہ
سوال کردی دبہ ابتہال درخواستی کہ چندیں سخن در توحید خاص بنویس قلم برگرفتم و بہ تائید ربانی در
کتاب آدم تا تمہ اجابت سوال تو کنم و دیخ شک و شبہہ از دامن یقین بہ آب تحقیق بشویم، رسالہ کو
میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو نظائر و امثال اور دلائل سے ثابت کیا ہے، طرز بیان دلنشین اور موثر ہے،

**توحید اخص الخواص۔** اس رسالہ میں بھی آیات و روایات اور نظائر و امثال سے وحدۃ الوجود
کو ثابت کیا گیا ہے، اور اس پر چھ دلیلیں قائم کی ہیں، ہر ایک دلیل بجائے خود دلنشین اور ایمان افروز
ہے، یہ رسالہ خواص کے لیے لکھا گیا ہے، چنانچہ تمہید میں لکھتے ہیں کہ بدانکہ نظما و نثرا "بنبشتہ" آمد ایں رسالہ
اخص الخواص نام نہادہ شد تا سالکان الہ و متصوفان درگاہ بہ یقین دل مطالعہ کنند حق تعالیٰ بفضل
اعظم سبب وصول شان گرداند بمنہ و کرمہ، "آٹھ صفحوں کا قلمی رسالہ ہے۔

**رسالہ وجود عالم و بدایت و نہایت عالم** صوفیوں کی اصطلاح میں ملک و ملکوت جبروت و لاہوت



کی تعریف کی ہے، صوفیوں کے لیے مضامین روح پرور ہیں، تمہید کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ "سخنے چند در
معرفت عالم از دانش و فہم خود در قید کتابت آدم و بگویم کہ باتفاق جملہ سالکان احت وجود عالم و بدایت
و نہایت عالم ہمچنین ست کہ در تحریر می آید، رسالہ مخطوطہ ہے۔

"رسالہ در بیان ہشت چیز بہ اصطلاح موحداں" عنوان کتاب سے ظاہر ہے کہ اس رسالہ میں
موحدوں کی اصطلاح خاص میں ہشتگانہ اشیاء کی تشریح ہے، اس تشریح میں توحید و موحد کی تعریف
و تقسیم اور الحاد و زندقہ ملحد و زندیق کی تمیز و تفریق پر بحث ہے، اس میں صوفی علماء کے لیے معلومات
و دلچسپی کا بڑا سامان ہے، رسالہ مخطوطہ ہے، ان کل رسائل کے کاتب مولانا شاہ محمد غلام یحییٰ رضوی
حلبی ابو العلائی ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۹۰ھ ہے۔

**اوراد دہ فصلی۔** اوراد و وظائف کا مستند نادر اور قابل عمل مجموعہ ہے، دیباچہ کتاب میں وجہ
یہ بیان کی ہے: " اما بعد از وقوف بر احادیث نبویہ و سنن سنیہ معلوم شد کہ اکثر اخبارے کہ در باب
وظائف و اوراد در بعض کتب متاخران مسطور است با فضائل کثیرہ و روایات غریبہ مشہور و متداول
است میان علماء و محدثان چون صحیح بخاری و صحیح مسلم و جامع ابو عیسیٰ ترمذی و سنن ابو داؤد و سنن نسائی
و سنن ابن ماجہ و سنن بیہقی و ابن السنی و مستدرک حاکم ابی عبد اللہ و طبرانی و سائر مسندا نیکہ معتمد علیہ
و صحیح است مروی نیست ........ علماء کہ از طرق قراۃ و سند علم حاصل کردہ اند و بانواع طرق
احادیث وقوف یافتہ و کتب موضوعات و معتبرات دیدہ و خواندہ چنیں فرمودہ اند اکثر ادعیہ و صلوات
و فضائل آں موضوع و مفتری است الا ادعیہ معدودہ و صلوات محصورہ کہ از مسندات ائمہ کبار
منقول است پس چوں علمائے ایں فن بوضع و افترا و بعضے ازیں قسم تصریح فرمایند ما را یقین و وقوف
بداں حاصل بناید بر آں اضعف ضعفا و تراب اقدام فقرا حسین منعم غفر اللہ لہ و لوالدیہ از بہر تحقیق
بعضے ادعیہ و فضائل آں را از کتب مذکورہ و اسانید مشہورہ بایجاز و اختصار در تالیف آوردہ

در ذیل ہر روایتے نام آں کتاب و در اسناد وے، روایت اصل را ذکر کردہ اند و آں را بدہ فصل در
آوردہ تا شاہد صالحے دعا بدے دست دولت بدامن ایں سعادت زند و باتباع اشرف کونین
افضل ثقلین بداں مداومت بماند و فتح ابواب سعادت نیل درجات قربی او گردد و ایں سبب چارہ
ندائے راہ او کند و بطفیل بخشدن شاء اللہ" یہ رسالہ ۴۳ صفحات کا ہے، اور مخطوطہ کے
کاتب سید ابو الحسن فردوسی بلخی ہیں، اور سنہ کتابت ۱۲۹۱ھ ہجری ہے،

گنج لایخفی، مخدوم الملک کی جن مجالس میں آپ کی حاضری اور شرکت ہوئی ہے، اور ان میں مخدوم کی
زبان فیض ترجمان سے جو حقایق و معارف سنے ہیں، انہیں گنج لایخفی کے نام سے قلمبند کیا ہے، اس کی
کی ابتدا میں لکھتے ہیں کہ "سعادت پابوس میسر شد ذکرے در تلاوت قرآن و استماع افتادہ۔ ایں بیچارہ
بشرف پابوس مشرف گشت بندگی خواجہ ابراہیم حاضر بودند پرسیدند کہ معنی در باخت و برخاست
بندگی مخدوم سلمہ اللہ فرمود یارزے بندگی حضرت علیا در خانہ ملک بدہ کو توال جلوس فرمودند سلمہ اللہ تعالیٰ" غرض ان
عنوانات
کے فرمودات و ملفوظات کو، ۵ مجالس میں ترتیب دیا ہے، مخدوم کی حیات ہی میں اسکو مرتب کر لیا تھا
کتاب ۸۳ صفحات کی مخطوطہ اور کتابت نستعلیق ہے، کاتب محمد یعقوب بلخی ہیں، اور سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ، اختتام کتاب کی
عبارت یہ ہے کہ "گنج لایخفی من کلام حضرت ملک المشائخ مولانا حسین معز شمس بلخی قدس سرہ، جس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب کو غلط فہمی ہوئی ہے، ملفوظات مخدوم الملک کے ہیں، مولانا حسین معز بلخی
اس کے کاتب ہیں،

مکتوبات: مکتوبات تصوف و سلوک معرفت و عرفان کا نادر مجموعہ ہیں، ان کے مطالعہ سے
قلب کو سکون، روح کو بالیدگی اور نفس مطمئنہ کو تواجد حاصل ہوتا ہے، بیشتر مکتوبات جوابی ہیں کل مکتوب
۱۵۴ ہیں، ہر مکتوب میں مکتوب الیہ کے نام اور موضوع مکتوب عنوان میں مذکور ہے، مثلاً "مکتوب
اول در توحید و معنی فنا، مکتوب الیہ مولانا نور الدین، مکتوب بست و سوم در آمدن علم بعمل



مکتوب الیہ مولانا سعد الدین مفتی جونپوری، مکتوب چہلم در کشادہ داشتن دیدہ حق بیں، مکتوب الیہ ملک القضاۃ
مکتوب صد و پنجاہ و چہارم بجانب سلطان ابراہیم خلد اللہ ملکہ وغیرہ

مکتوبات کے مضامین پانچ حصوں پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں، اول تربیت و تعلیم اور پند و نصائح
دوم آیات و روایات اخبار و آثار کی تفسیر و تشریح، سوم بزرگان سلف کے ابیات و اشعار
پر تنقید اور ان کی توضیح، چہارم مسائل شرعیہ کے حکم و مصالح، پنجم سلوک و تصوف کے اسرار و رموز
مکتوب الیہم میں اس عہد کے مشاہیر قضاۃ و ائمہ و مفتی اور علما و فضلا اور صوفیائے کبار ہیں، چند مکتوب
حاکم وقت اور متوسلین حکومت کے نام بھی ہیں، مثلاً امام حسام الدین صدر الائمہ قاضی قمر الدین صدر الائمہ
مولانا سعد الدین مفتی جونپور و پیر طریقت مولانا تاج الدین، خواجہ شہاب الدین، مولانا کبیر الدین، مولانا
سماء الدین و مولانا بہاء الدین خان اعظم ملک القضاۃ سلطان ابراہیم قاضی احمد حاکم وغیرہم،

مکتوبات کے مرتب آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا شیخ حسن بلخی رحمۃ اللہ علیہ شارح حضرات
خمس ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی حیات ہی میں اس کی تدوین ہو چکی تھی، چنانچہ حضرت مرتب لکھتے
ہیں کہ آنحضرت اعنی شیخ المشائخ و شیخ الاسلام بدر الحق والحقیقۃ والشرع والدین شیخ حسین معز
شمس بلخی متعنا اللہ بطول بقائہ، اس سے یہ بھی قیاس ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ انکی نظر سے گذرا ہے، مکتوبات
بصائر علمی و اسرار روحانی کے آئینہ دار ہیں صاحب اخبار الاخیار[1] نے شیخ بن معز شمس بلخی کے حالات
میں لکھا ہے کہ "و او را نیز مکتوبات است بطرز مکتوبات شیخ بزرگ اعنی شیخ شرف الدین قدس سرہ مضمن اسرار
توحید و باعث بر اختیار تجرید بزبانے لطیف و بیانے عجیب" چند مکتوبات کی عبارتیں بھی نقل کی
ہیں، مکتوبات صد و پنجم تک اردلی چکنا سفید کاغذ بخط شفیعہ ہے اور صد و ششم سے سفید اور دبیز چکنے
کاغذ پر ہے، خط نستعلیق ہے، مگر بعض مکتوب سے الفاظ و حروف اور جملے تک غائب ہیں، عنوانات
مکتوب شنجرفی حروف میں ہیں، پیش نظر مجموعہ میں مکتوب صد و سی و سوم در عشق مجاز کے بعد سی مکتوبات

[1] اخبار الاخیار ص ۱۳۹

صد و پنجاہ و چہارم تک بیس اکیس مکتوبات غائب ہیں، شان کتابت اور کاغذ اور کرم خوردگی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ قدیم تر ہے، لیکن سنہ کتابت اور کاتب لا معلوم ہے

"اجازت نامہ برائے دادن توبہ مسلمانان مرفرزندم مولانا حسن را"

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد وآلہ الطیبین الطاہرین۔ اما بعد، ایں فقیر در توبہ دادن مسلمانان از جہت شیخ الاسلام والمسلمین شیخ مظفر برداللہ مضجعہ مجاز بود فرزند عزیز الوجود مولانا حسن را از جہت خود برائے توبہ دادن مسلمانان مجاز گردانیدہ تا مسلمانان را توبہ دہد و مقراض راند و طاقیہ دہد و دعوی بر صلاح و تقوی کند و خود قدم بر جادہ شرع استوار دارد و در طلب علوم دین باقصی الغایت جد و جہد مصروف دارد والحمد للہ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وسلم وکان ذالک فی السادس من ربیع الآخر سنہ اثنی واربعین وثمانماۃ ۸۴۲ھ تمام شد

دیوان فارسی | دیوان آج سے مدتوں پہلے طبع ہو چکا ہے، مگر اب کمیاب ہے، زیر نظر مطبوعہ دیوان میں ۴۴ غزلیں ردیف وار چھ سات قطعات، پانچ چھ رباعیات اور گیارہ متفرق اشعار ہیں، ایک قصیدہ بھی باب فقر میں ہے، کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے مربی و شفیق استاد مولانا مظفر بلخی المتخلص بہ آن سے مشورہ سخن کرتے تھے، زبان کی فصاحت معنی کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی کلام کی پختگی کی شاہد ہے، پورا کلام عارفانہ اور کیف و مستی سے لبریز ہے، خیالات پر عطار کا گہرا اثر ہے، شوخی کلام پر حافظ شیرازی کا دھوکا ہوتا ہے، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں،

| | |
|---|---|
| اے صفائے چہرۂ تو داد صوفی را صفا | سجدہ گاہِ ابرویت محراب اہل اصطفا |
| گہ دو لعلش بادہ گردد گہ خورد خون جگر | گہ دو چشمش دلنواز و گہ کند جور و جفا |
| یار زیبا گر زند خنجر بطرفم دم مکش | کاندریں رہ شرط کار دوستی باشد وفا |
| گر حسینؔ از تیغ ہجران کشتہ گردد باک نیست | ہر حسینِ عاقبت دارد یزیدے در قفا |



| | |
|---|---|
| ما را نظر بروے تو فردوس اکبر است | فردوس بے جمال تو زنزئی محقر است |
| موسیٰ و شنیم زشاخ درختِ وجود خود | در گوش جاں ندائے انا الحق مقرر است |
| مطرب بیا و نغمۂ عشاق را نواز | ساقی بیا با دہ کہ محبوب در بر است |
| از جزو کل ہر آنچہ تصور کند خیال | ہر ذرہ ز نور حقیقت مصور است |

| | |
|---|---|
| غرقۂ بحر بیکراں مائیم | گاہ موجیم و گاہ دریائیم |
| چوں دوئی نیست درمیانۂ ما | ما ہمہ او و او ہمہ مائیم |
| ما بداں آمدیم در عالم | تا خدا را بخلق بنمائیم |
| یار را عین نور دیدہ ماست | لاجرم ما بعین بنمائیم |
| گر کسے صورت خدا طلبد | روے خوباں حسین بنمائیم |

| | |
|---|---|
| خال او فتوی دہد کز کعبہ در بتخانہ شو | زلف او دعوی کند گر عاقلی دیوانہ شو |
| بر دل مشتاق آید ایں خطاب از عارضش | کعبہ را یکسو بنہ بیزار از بتخانہ شو |
| اے صدف کز بحر ہستی حاصلے جوئی اگر | سینہ را صد پارہ گرداں تا دُر یکدانہ شو |
| در خرابا تیکہ مستاں جام وحدت در کشند | چوں حسینؔ از بادہ ہر درد را پیمانہ شو |

| | |
|---|---|
| شہیکہ ملک دو عالم جمال حضرت اوست | قبائے کون و مکاں کمترین کسوت اوست |
| ظہور نور تجلی کہ بر جبیں بتاں است | ہمہ لطافت و خوبی ہمہ ملاحت اوست |
| جمال منظر نیکو ہر آنچہ در نظر است | چو نیک نیک بہ بینی کمال طلعت اوست |
| اگرچہ صورت اشیا تعدد است ولیک | ہمہ حقیقت اشیا شمول وحدت اوست |
| ز انتظار بقایش کند حسین گہے | کہ در مقابل چشمش ہمہ صورت اوست |

(باقی)

# خوب چند ذکا اور مرزا غالب

از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ریڈر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

غالب کے قیام آگرہ کے متعلق عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعراء دو بڑے اہم مآخذ ہیں، اول الذکر کے بارے میں راقم الحروف نے ایک مقالہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس دسمبر ۱۹۵۵ء منعقدہ انا ملائے یونیورسٹی، انا ملائے نگر (جنوبی ہند) میں پڑھا تھا[1]، اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اعظم الدولہ سرور (مولف عمدۂ منتخبہ) نے مرزا غالب کے جو حالات اپنے تذکرے میں لکھے ہیں اور ان کے جو اشعار نمونہ کے طور پر نقل کیے ہیں وہ مرزا کے قیام اکبر آباد ہی سے متعلق ہیں، سطور ذیل میں دوسرے ماخذ عیار الشعرا سے بحث کی گئی ہے۔ اس تذکرہ کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں اور دوسرا ناقص و ناتمام نسخہ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ میں موجود ہے، اس وقت میرے پیش نظر انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ ہے۔

عیار الشعراء کا مؤلف "خوب چند بن بھوانی چند بن رائے سلامت رائے بن عجائب رائے قوم کایتھ ماتھر، آل براہمنہ، متوطن سکندر آباد، ساکن دہلی، المتخلص بہ ذکا ہے"[2] شیخ محمد اکرم صاحب آثار غالب نے نہ معلوم کس طرح لکھا ہے کہ اس تذکرہ کے نسخۂ لندن پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے[3]، حالانکہ دیباچہ میں ذکا نے پورا قطعۂ تاریخ لکھا ہے، ملاحظہ ہو،

---

[1] غالب کا قیام آگرہ اور تذکرۂ سرور مخطوطۂ لندن" از خواجہ احمد فاروقی مطبوعہ رسالہ "آجکل" دہلی غالب نمبر فروری ۱۹۵۷ء [2] عیار الشعراء: انڈیا آفس لائبریری لندن [3] آثار غالب: شیخ محمد اکرم طبع چہارم ص ۲۲ و ۲۳



تاریخ تذکرہ کہ بدیہہ بخاطر گذشتہ نیز صحیح نمودہ باللہ التوفیق۔ ابیات:-

اے ذکا ہو چکا جس روز یہ نسخہ طیار آگے ہاتف کے گیا پیر خرد نے مذکور

منصفی کر کے وہیں اس نے یہ تاریخ کہی آفریں کہہ کہ کیا نام سبھوں کا مشہور[1]

آخری مصرع سے ۱۲۰۸ھ (مطابق ۱۷۹۳ء) تاریخ نکلتی ہے، جس کو اس تالیف کا سال آغاز تو کہا جا سکتا ہے، لیکن بعض اندرونی شہادتوں کی بنا پر سال اختتام کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا،

عیار الشعرا میں دو تاریخیں اور درج ہیں:

(۱) منت کے ترجمہ میں لکھا ہے:

"میر قمر الدین منت والد ماجد میر نظام الدین ممنون از سادات قصبہ سونی پت مرید جناب مخدومی مولوی محمد فخر الدین قدس اللہ سرہ العزیز در سنہ یک ہزار و دو صد و ہشت ۱۲۰۸ھ ہم رکاب راجہ تکیت رائے بہ کلکتہ رسیدہ راہی شہر آخرت گردید"[2]

(۲) مقبول کے حال میں لکھا ہے:

"مقبول تخلص نوشق از تلامذۂ میاں نصیر، در ۱۲۴۷ھ از ضلع ٹانڈہ در دہلی وارد شدہ بود، این اشعار از دست "[3]

ان وجوہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ عیار الشعرا ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) اور ۱۲۴۷ھ (سنہ ۱۸۳۱) کے درمیان ترتیب دیا گیا۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر گارساں دتاسی کا بھی یہی خیال ہے:

"یہ (عیار الشعرا) دہلی کے خوب چند ذکا کا تذکرہ ہے، جس کو انھوں نے

---

[1] عیار الشعرا: ذکا (لندن) [2] ایضاً [3] ایضاً

بزبان فارسی ۱۲۴۷ھ (۲-۱۸۳۱ء) میں یا ۱۲۰۸ھ (۹۴-۱۷۹۳ء) سے لیکر ۱۲۴۷ھ

(۲-۱۸۳۱ء) کے درمیان مرتب کیا، خود اپنے بیان کے مطابق اس تذکرہ پر ۱۳ سال اپنے

استاد میر نصیر الدین ناصر المعروف بہ کلو کے ایما سے صرف کیے، ذکا نے ۱۲۶۶ھ میں انتقال

کیا اور یہ سال وفات ڈاکٹر اسپرنگر کو خود ذکا کے بیٹے سے معلوم ہوا۔[1][2]

ڈاکٹر اسپرنگر نے بھی عیار الشعراء کی مدت تصنیف ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) اور ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) کے درمیان

قرار دی ہے[3]،

خوب چند ذکا نے مرزا کا حال غالب کے ذیل میں لکھا ہے، ترجمہ کا متن یہ ہے:۔

"مرزا اسد اللہ خان غالب، عرف مرزا نوشہ، المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ خان

عرف مرزا دولہہ نبیرہ مرزا غلام حسین کمیدان ساکن بلدہ اکبر آباد، شاگرد مولوی محمد معظم، شاعر

فارسی و ہندی است۔ از وست[3]"

یادگار غالب[4]، تذکرہ گلستان بے خزاں[5]، اور عیار الشعرا[6] میں غالب کے استاد کا نام محمد معظم لکھا ہے،

جس میں شبہہ کی گنجایش نہیں، دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ ذکا نے اس ترجمہ میں غالب کو اکبر آباد کا ساکن

لکھا ہے۔ اگر غالب تحریر کے وقت دہلی میں ہوتے تو ذکا اس کی تصریح ضرور کرتے، جیسا کہ خود انھوں نے

اپنے متعلق لکھا ہے: "متوطن سکندر آباد و ساکن دہلی" یا جیسا کہ غالب کے متعلق کریم الدین[7]، میر محسن علی محسن[8]،

مرسید، شیفتہ[9] اور ناسخ[10] نے صراحتاً لکھا ہے کہ ان کا مولد اکبر آباد اور مسکن دہلی ہے، اس لیے قرینہ

غالب ہے کہ ذکا نے ان کے جو اشعار نمونۃً دیے ہیں، وہ بھی آگرہ ہی کی تخلیق ہے، ان میں چار شعر ایسے

ہیں جو نسخۂ حمیدیہ اور مروجہ دیوانوں میں نہیں اور ہمارے لیے بالکل نئے ہیں:۔

---

[1] پہلی تذکروں سے ماخوذ ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات، گارساں دتاسی طبع دوم پیرس ۱۸۶۸ء [2] یادگار شعرائے

[3] عیار الشعرا مولفہ خوب چند ذکا نسخہ لندن [4] یادگار غالب (طبع علیگڈھ) ص ۳، [5] تذکرہ گلستان بے خزاں مطبوعہ

نولکشور ۱۸۷۵ء [6] عیار الشعرا (مخطوطہ انڈیا آفس) [7] تذکرہ کریم الدین ص ۴۷، [8] سراپا سخن ص ۳۴۷، [9] تذکرہ

اہل دہلی ص ۱۰۶، [10] گلشن بے خار (نولکشور) ص ۱۳۵ [11] سخن شعرا (نولکشور) ص ۳۴۲



نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

یہ شعر نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہے،

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

یہ شعر بھی نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہے،

باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چاہوں گر سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

یہ شعر بھی نسخۂ بھوپال کے ص ۱۹۹ پر درج ہے،

صبا لگا وہ طمانچے طرف سے بلبل کے
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

یہ شعر بھی نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہے،

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنسے کو رولایا ہے کہ جی جانے ہے

یہ شعر بھی نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہے،

اشعار ذیل نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہیں۔ (ص ۶۶):

حسن غمزہ کی کشایش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

ذکا نے کشایش لکھا ہے، نسخۂ حمیدیہ میں کشاکش ہے۔

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد[1]

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

---

[1] ایں مصرع ہمیں طور در اصل مسطور بود ۱۲ (ذکا)

# وفیات

## موت العالم

از جناب شاہ محمد حسن عطا، ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید احمد شہید کی رائے بریلی میں کئی تاریخی قصبات ہیں، جا لس جس کے بطن سے پدماوت کا شہرہ آفاق مصنف پیدا ہوا، نصیر آباد جس کے آغوش میں اولوالعزم سادات پلے، سلون جہاں بیٹھکر سالکان حقیقت نے معرفت کا درس دیا، اور ویزکیھم ویعلمھم الکتاب کی سنت پر عمل پیرا ہوئے۔ عہد کہن کی مرثیہ خوانی اور درس سلوک کی حکایت بیان کرنے کے لیے اب تک سلون میں ایک پرشکوہ آرام گاہ موجود ہے، جس پر ذیل کی تاریخ ثبت ہے۔

حضرت پیر محمد قطب دیں — چوں ز دنیا با دلِ آگاہ رفت
سال تاریخ شہ ہر دو سرا — گفت ہاتف عارف باللہ رفت

اس آرام گاہ میں وہ خدا رسیدہ بوریا نشینان مسند بے نیازی محو خواب ہیں، جو کبھی کج کلاہوں کی شوکت سے مرعوب نہ ہوئے، اور جن میں سے ہر ایک نے بڑے وقار اور شریعت و طریقت کی جامعیت کے ساتھ زندگی گذاری، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے جو تیموری دبدبہ کی آخری یادگار تھا، اسی مقبرہ کے ایک ابدی مکین حضرت پیر محمد سلونی کو عطاء ملوکانہ سے سرفراز کرنے کے لیے طلب کیا انھوں نے قلندرانہ جواب دیا



فقیر را ایں حوصلہ نمی آید۔ دہقانی را در مجلس سلطانی چہ کار باز سے دارم چوں گرسنہ می شوم مہمانی میکند وچوں می خسپم پاسبانی میکند، گاہے گاہے کسے از راہی می آید، در کریم باز است وکریم ما بے نیاز، اللہ بس باقی ہوس۔

ان ہی صاحبان قبور میں پیر اشرف، پیر پناہ، پیر عطا اور جانشینان اورنگ زیب کے مخدوم حضرت شاہ کریم عطا سلونی ہیں، جن سے ملنے کے لیے نہ صرف شاہ عالم، صفدر جنگ، شجاع الدولہ بلکہ مجاہد کبیر عارف باللہ حضرت سید احمد رائے بریلوی بھی سلون آئے، ان ہی میں ابو الفضل ظہیر الدین شاہ پناہ عطا اپنی الگ علمی منزلت رکھتے تھے، احمد شروانی، حضرت شاہ عبد العزیز، مرزا قتیل، اور اس دور کے دوسرے اکابر و مشاہیر سے آپ کے معاصرانہ تعلقات تھے، مشکوٰۃ پر آپ کی تعلیقات آپ کے علمی کمال کی شاہد ہیں، اسی سلسلہ کے ایک بزرگ شاہ حسین عطا نے نواب سعادت علی خاں کی اس ترغیب و ترہیب کو کہ اگر وہ تیشع قبول کرلیں تو جائداد میں اضافہ ہوگا ورنہ ضبط ہو جائے گی، حقارت سے ٹھکرا دیا، اس سجادہ کی آخری زینت میرے دادا حضرت شاہ مہدی عطا صاحب قدس سرہ تھے، جنھوں نے تصوف پر ایک بے مثل تصنیف لمعۃ الانوار یادگار چھوڑی ہے، آپ فارسی، اردو، ہندی تینوں زبانوں میں بڑے خوش گفتار تھے، اس مقالہ کی شخصیت کو آپکی فرزندی کا شرف حاصل ہے۔

صدر المحدثین حضرت مولانا حافظ شاہ محمد حلیم عطا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۱ھ میں سلون میں پیدا ہوئے، آپ کی والدہ دیوہ شریف (ضلع بارہ بنکی) کے ایک عالی نسب سادات گھرانے سے تھیں، ابھی عہد شیر خوارگی پر چند ہی ماہ گذرے تھے کہ آپ مادرانہ شفقت سے محروم ہو گئے، پھر زندگی کی ساتویں بہار کا آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ آپ یتیم الطرفین ہو گئے، اس جانگداز واقعہ کے بعد خاندان کے اقتدار کی باگ ایسے ہاتھوں میں پہنچ گئی، جنھوں نے اس سجادہ کے تقدس کو خاک میں ملا دیا،

اور چند ہی برسوں کے اندر اس کے زمین و آسمان بالکل بدل گئے ع

افسوس اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

لیکن عین اسی زمانہ میں اس خانقاہ میں ایک ایسی شخصیت پیدا ہوئی جس نے اس کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال لیا، یہ شخصیت جناب مولانا شاہ حلیم عطا رحمہ اللہ کی تھی، آپ نے نہایت کم عمری میں درسیات سے فراغت حاصل کر لی تھی، اور ایام شباب میں خاندانی کتب خانہ کی تمام کتابیں آپ کے مطالعہ سے گذر چکی تھیں، اسی زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں کے استاد حضرت شیخ حسین ابن محسن یمانی سلون میں فروکش ہوئے، ان سے حدیث کی باقاعدہ سند لی، پھر جب میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد مولانا ابوالحسن دہلوی کئی برس تک سلون میں آکر مقیم ہوئے، تو ان کی نگرانی میں حدیث کا مطالعہ کیا، پھر جب بائیس سال کی عمر سے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہونے لگا۔ تو وہاں کے کتب خانوں سے واقفیت حاصل کی اور علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس ملاقات کا ذکر والد صاحب ہمیشہ بڑے فخر و مباہات سے کرتے تھے۔

اس زمانہ میں مولانا عبد الحئی صاحبؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مطب کرتے تھے، جب کبھی والد صاحب کا گذر ادھر سے ہوتا تو وہ بڑی شفقت اور عنایت سے بلا کر بٹھلاتے تھے، ان صحبتوں نے طبیعت میں بڑی جلا پیدا کی، اور تاریخ و حدیث کے نکتہ داں بننے میں بہت مفید ثابت ہوئیں، میرے عہد شیر خوارگی میں علاج کے سلسلہ میں جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں کچھ دنوں قیام کرنا پڑا، اس قیام کے زمانہ میں ایک نئی تبدیلی پیدا ہوئی، درس نظامی سے طبیعت ہٹی اور ندوہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا، مولانا سید طلحہ حسنی ایم اے، شیخ خلیل عرب اور مولانا کلیم احمد سے تمام زندگی کی موت کا رشتہ قائم ہوا، اور مولانا یوسف سورتی اور شیخ خلیل عرب کی صحبت میں مینی مصنفین سے شناسائی حاصل ہوئی، اس سے نگاہ میں بڑی وسعت پیدا ہوئی، اور دمشق



قاہرہ، بیروت اور لندن وغیرہ کی مطبوعات منگا کر مطالعہ میں رہنے لگیں، اور اس کا سلسلہ برابر جاری رہا، تا آنکہ آج سے سولہ سترہ سال پہلے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ العالی کی ترغیب پر والد صاحب نے ندوہ سے باضابطہ تعلق پیدا کر لیا، تنخواہ کی ابتدا چالیس روپیہ ماہوار سے ہوئی، اگرچہ یہ معاوضہ بہت قلیل تھا، اور سلون میں ان کو تمام آسائشیں میسر تھیں، لیکن محض علم کی خدمت کے ذوق میں اس کو قبول کر لیا، اور سولہ سترہ سال کی مدت میں بڑے بڑے انقلابات آئے، بہت سے اساتذہ نے دوسرے اداروں کا رخ کیا، لیکن والد صاحب کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، اور انھوں نے منصب وجاہ اور دولت دنیا کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اور نہ کبھی ندوہ کی مجلس انتظامیہ سے اپنے علم کا بھاؤ طے کیا، جب میں علی گڈھ اور دہلی سے گھر جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے ندوہ ٹھہرتا تھا تو ان کی انتہا سے زیادہ سادگی کو دیکھ کر مجھے سخت رنج ہوتا تھا۔ بعض طالب علموں کو اپنی اولاد پر بھی ترجیح دیتے تھے، کتابوں کے عاشق تھے، لیکن پنجاب کے ایک طالب علم کو طبقات ابن سعد کا پورا سٹ دیدیا، لکھنے والے ان سے تصنیف و تالیف میں مدد لیتے تھے، لیکن محترمی مولانا محمد اویس ندوی، مولانا ظفیر الدین اور مولانا مجیب اللہ ندوی کے علاوہ کم لوگوں نے اس کا اعتراف کیا ہے، علمی تبحر کا یہ عالم تھا کہ تفسیر، حدیث، رجال، فقہ، تاریخ وغیرہ جملہ علوم پر ان کی نگاہ یکساں وسیع تھی، دقیق سے دقیق مسائل کو ارتجالاً حل کر دیتے تھے، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ والد صاحب کے کمالات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"طالب علمی کے بے قاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا اور دو کتب خانے دیکھے، ایک زندہ و متکلم۔ ایک جامد و خاموش۔ زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ۔ شاہ صاحب کے واسطہ سے

حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب اور امام عبد الهادی کی کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جاکر احیاء العلوم مع تخریج عراقی، فضل علم السلف علی الخلف، دفائن الکنوز، تلبیس ابلیس، مختصر منہاج القاصدین وغیرہ منگوائیں۔" الخ

مولانا سید محمد ناظم صاحب ندوی شیخ الجامعہ العباسیہ تعزیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"شاہ صاحب کے انتقال سے ایک بڑے عالم، محدث، مورخ اور ایک صوفی درویش کی جگہ خالی ہوگئی اور دار العلوم ندوہ ایک متبحر اور ایک بے مثل محدث و مورخ کے فیوض علمیہ سے محروم ہوگیا، میرے ایک مخلص دوست تھے اور انھوں نے میرے ساتھ برادرانہ اور عالمانہ سلوک کیے۔"

مولانا عبد السلام صاحب قدوائی صدر شعبۂ دینیات جامعہ اسلامیہ لکھتے ہیں:-

"شاہ صاحب کی وفات کا سانحہ حد درجہ ملال انگیز ہے، اب ایسا علم و فضل، ذہانت و ذکاوت قوت حافظہ کاہے کو کہیں نظر آنے لگا، مجھ پر خاص طور سے شفقت فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ اپنے دامان رحمت میں جگہ عنایت فرمائے، ایسے اشخاص صدیوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں۔"

مولانا مسعود عالم ندویؒ نے ایک بار اپنے ایک دوست کو تحریر فرمایا تھا:-

"کانوں نے جب سے سننا شروع کیا ہے اور آنکھوں نے جب سے دیکھنا، یہ تبحر نہ دیکھا نہ سنا۔"

مولانا حیدر حسن خاں صاحب مہتمم دار العلوم نے جب ضابطہ کے طور پر ندوہ کی کرسی حدیث کے لیے حضرت سید صاحبؒ سے والد کا تعارف کرایا تو انکے الفاظ بعینہٖ یہ تھے "میاں حدیث یہ ہم سے بھی زیادہ جانتے ہیں"۔

والد صاحب کو زندگی کی مصروفیات نے اس کا موقع نہ دیا کہ وہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر علمی مرکزوں کو دیکھ سکتے، ورنہ آج پوری علمی دنیا میں انکا ماتم ہوتا۔ والد صاحب نے کسی اکیڈیمی میں تصنیف و تالیف کا کام نہیں سیکھا، پھر پانچ خورد سال اور دو جوان اولادوں کی موت نے انھیں بالکل مضمحل کردیا تھا، خاندانی تلخیاں علحدہ تھیں، ان حالات میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیے اور جو تصانیف



یادگاریں چھوڑیں، دوسرا شخص مشکل ان کو انجام دے سکتا، انکی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱) الکتاب الکریم فی استخراج الدر من القرآن العظیم (۲) نخبۃ لسان العرب فی لغات القرآن العجیب (۳) المعجم المفہرس (۴) تیسیر الوصول الی اطراف اصحاب الاصول (۵) فتح المنعم فی اطراف الامام مسلم (۶) الیواقیت الثمینہ فی اطراف عالم المدینہ (۷) تعجیل المنفعہ فی اطراف الائمۃ السبعہ (۸) اسماء اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکناہم عمن روی عنہم الائمۃ السبعہ (۹) دیوان شعر

شعر و سخن سے بھی ذوق تھا، مگر طبیعت مشکل پسند تھی، اس لیے اردو کے بجائے عربی شاعری کی جانب توجہ کی، ان کی شاعری میں بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ حالی کی سی سادگی پائی جاتی تھی، بحتری، ابن معتز اور ابوالفراس سے زیادہ متاثر تھے، ذیل کے اشعار سے انکی عربی شاعری کا اندازہ ہوگا، یہ اشعار انھوں نے اس وقت کہے تھے جب ۱۹۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ پاکستان سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔

بشری لکم یا معشر الندلان — بقدوم سیدنا ابی سلمان

کنزول غیث بعد طول قنوطها — او نفحة الارواح فی الابدان

اعنی به حبل التقی علم الهدی — بحر العلوم خزینة العرفان

والسید العلام فخر زمانه — کنز المعارف منبع الاحسان

قد جاءنا نعم المجیٔ فمرحب — لسحاب رحمة ربنا الرحمن

اهلاً وسهلاً بالذی یشتاقه — کل امرئ کالماء للظمآن

یارب متعنا بطول بقائه — وادمه فینا دائم الفیضان

اردو اور فارسی سے بعض پرانے علماء کی طرح بے تعلق نہیں تھے، بلکہ اسکا بھی بہت اچھا ذوق رکھتے تھے لیکن تمام علوم میں ان کو خاص ذوق احادیث نبوی سے تھا، قرآن مجید کی تفسیر میں انھوں نے مولانا ابوالحسن علی صاحب کو معیار پایا اور احادیث کی تشریح و تاویل میں والد صاحب کو۔ وفات سے کچھ دنوں پیشتر

والد صاحب نے دہلی کا سفر کیا، اس سفر میں انھوں نے میری مملوکہ فارسی کتابوں کو سرسری نگاہ سے دیکھا، اور آقای علی اصغر حکمت کی امثال قرآن کو پڑھ کر اس بارہ میں امام ابن قیم اور بعض دوسرے علماء کے بے نظیر نظائر بیان کیے کاش میں نے اس تقریر کو محفوظ کرلیا ہوتا، دو سال ہوئے ان کے ایک شاگرد رشید مولوی عبدالرشید لداخی نے علم کلام سے متعلق اپنے تحقیقی مقالہ کا ذکر کیا اس سلسلہ میں والد صاحب ڈیڑھ دو گھنٹے تک علم کلام، متکلمین اور حکمائے اسلام پر تقریر کرتے رہے، اگر اس کو قلمبند کرلیا جاتا تو علم کلام پر ایک مختصر اور جامع رسالہ تیار ہو جاتا،

حدیث ان کا خاص فن تھا، اور اس فن کی تمام متداول و غیر متداول کتابیں ان کے کتبخانہ میں موجود تھیں، بلا مبالغہ کئی ہزار حدیثیں مع سند انھیں حفظ تھیں، اور میں نے ان کے ایک معاصر کو کہتے ہوئے سنا کہ شاہ صاحب کے لیے کم و بیش وہی الفاظ کہے جا سکتے ہیں جو ابن تیمیہ کے کسی قدر شناس نے ان کے لیے استعمال کیے تھے کہ "حدیث لا یعرفہ ابن تیمیۃ فھو لیس بحدیث"

حافظ قرآن تھے اور ۱۴ سال کی عمر سے لیکر آخر تک برابر تراویح میں کلام مجید سناتے تھے، اردو اور فارسی کے سیکڑوں اشعار نوک زبان تھے، اردو کی طویل اور مرصع نظمیں کہہ دینا ان کے لیے بہت آسان تھا، حالی اور اکبر کو بہت پسند کرتے تھے،

میرے بڑے بھائی مرحوم کی تعلیم و تربیت انھوں نے بڑی توجہ سے کی تھی، اگر وہ زندہ رہے ہوتے تو علمی و دینی اعتبار سے ہندوستان کے ہونہار اور نامور نوجوانوں میں ہوتے، مگر افسوس کہ عین عنفوان شباب میں ان کا انتقال ہوگیا، اس غم نے والد صاحب پر وہی اثر ڈالا جو فردوسی کے بیٹے کی موت نے اس پر ڈالا تھا، وہ بالکل ٹوٹ گئے اور عمر سے پہلے بوڑھے ہوگئے، طبیعت زندگی سے اچاٹ ہوگئی، لیکن صبر کا یہ عالم تھا کہ جب میں علی گڈھ سے بھائی جان کی موت کے تیسرے دن سلون پہنچا تو وہ نشستگاہ کے سامنے غالباً شذرات الذہب پڑھ رہے تھے اور ان کے چہرے سے کسی قسم کا حزن و ملال ظاہر نہ ہوتا تھا،



سلون اور لکھنؤ میں جن لوگوں کو والد صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ انکا کردار کس قدر پاک تھا اور وہ کس قدر معصوم اور فرشتہ خصلت انسان تھے، میں نے ان کو کسی شخص سے الجھتے نہیں دیکھا، میرے دادا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پورا علاقہ چھوڑا تھا، انکی موت کے بعد یہ دولت بے دریغ لٹتی رہی لیکن والد صاحب میں اسقدر استغنا تھا کہ انھوں نے اس میراث کو جائز طور پر بھی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی،

والد صاحب مرحوم یوں بھی خلقۃً کمزور تھے، مسلسل حوادث نے ان کو اور زیادہ ضعیف اور نڈھال کردیا تھا، وفات سے چند مہینہ پیشتر فالج کا اثر ہوا، ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب، ڈاکٹر عبد الحمید صاحب اور کرنل اندر سنگھ کے علاج سے وہ قریب قریب صحتیاب ہوگئے اور تبدیل آب و ہوا کی غرض سے الہ آباد تشریف لے گئے، وہاں بھی علاج ہوتا رہا اور میں دہلی چلا آیا، ایک دن ۷ر اکتوبر ۵۵ء مطابق ۲۰ر صفر المظفر ۷۵ھ کو جمعہ کے دن دفعۃً وفات کا تار ملا، میں نے اسی وقت دہلی سے ٹرنکال کیا، اور یہ طے ہوا کہ دائرہ حضرت شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں تدفین ہو، اور میں ہوائی جہاز کے ذریعہ لکھنؤ پہنچا، وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ ندوہ کے اساتذہ اور طلبہ کا ایک گروہ الہ آباد روانہ ہو چکا ہے، ادھر ہزار دقتوں کے بعد لاش کو الہ آباد سے بذریعہ پرائیوٹ کار رائے بریلی لایا گیا، میں لکھنؤ سے سیدھا رائے بریلی پہنچا، یہاں پہنچکر میری رائے بدل گئی اور والد صاحب کو سلون لیجا کر اس کتبخانہ کے سامنے جہاں بیٹھکر انھوں نے غزالی و رازی اور ابن تیمیہ و ابن قیم سے سرگوشیاں کی تھیں، سپرد خاک کیا، اب یوم نشور تک اس دور کا یہ گمنام محدث یوں ہی محو خواب رہے گا، اللہ تعالیٰ اس کی تربت پر رحمت و رضوان کے پھول برسائے۔

---

مقالات شبلی حصہ سوم

مولانا کے تعلیمی مضامین کا مجموعہ، قیمت: عہ

منیجر

# ادبیات

## یادِ سہیل

از جناب حبیب احمد صاحب صدیقی سکریٹری یوپی گورنمنٹ

یکتائے روزگار سخنور نہیں رہا
اہلِ نظر کا اب کوئی رہبر نہیں رہا

بالغ نظر ادیب، حقیقت نگر حکیم
علم و ادب کو ناز تھا جس پر نہیں رہا

توقیر شاعری تھی جنابِ سہیل سے
شعر و سخن کا اب وہ مقدر نہیں رہا

جس کی ضیائے علم سے روشن تھا اک جہاں
صد حیف اب وہ مہرِ منور نہیں رہا

رعنائی خیال تھی جس کی نظر فروز
وہ دانش و خرد کا پیمبر نہیں رہا

جس نے رموزِ حکمت و ایماں کیے عیاں
دریائے علم کا وہ شناور نہیں رہا

نعتوں نے جس کی دھوم مچا دی تھی چار سو
وہ مدح خوانِ ساقیِ کوثر نہیں رہا

فاروقی کا جو مرتبہ داں تھا وہ چل بسا
رمز آشنائے سطوتِ حیدر نہیں رہا

بزمِ سخن کی شمع فروزاں ہوئی خموش
کیا رہ گیا جو شعلۂ مضطر نہیں رہا

نوواردانِ دشتِ سخن اب کریں گے کیا
جس سے امید تھی وہی رہبر نہیں رہا

رہتے تھے جس کے آگے مضامین صف بہ صف
وہ قادر الکلام سخنور نہیں رہا

تھے اہلِ ذوق تشنۂ صہبائے شاعری
یہ کیا ہوا کہ دور میں ساغر نہیں رہا

سرچشمۂ خلوص و محبت تھی جس کی ذات
دشمن سے بھی کبھی وہ مکدر نہیں رہا

تیغِ ستم کے سامنے وہ تھا سر بکف
آزادیِ وطن کا پیمبر نہیں رہا

کیا پوچھتے ہو ہم سے ہماری زباں کا حال
جو پھر نہ پا سکیں گے وہ گوہر نہیں رہا



# مطبوعاتِ جدیدہ

**اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ**
از جناب ڈاکٹر محمد عزیز لکچرار شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، تقطیع اوسط، ضخامت ۳۰۷ صفحات، کاغذ، کتابت اور طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ۔

اردو کے ہندوستان کی مشترک اور مقبول عام زبان ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ یہاں کے تمام اہل مذاہب، ان کے مصلحین اور مختلف فرقوں نے اپنے مذہب اور اصلاحی تحریکوں کی اشاعت و تبلیغ کا ذریعہ اردو کو بنایا، چنانچہ ہندو، جین، سکھ، عیسائی، بہائی، ہندوؤں کے اصلاحی فرقوں میں کبیر پنتھ، برہمو سماج، آریہ سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، رادھا سوامی مت اور دیو سماج وغیرہ نے اردو کے ذریعہ اپنی تبلیغ و اشاعت کی، اپنی مذہبی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا، ان کی شرحیں اور مستقل کتابیں لکھیں، تبلیغ و اشاعت کے لیے اردو میں اخبارات و رسالے نکالے، چنانچہ ہندوستان کے تمام مذاہب کے متعلق اردو میں اتنا لٹریچر موجود ہے جو ان مذاہب سے واقفیت کیلیے بالکل کافی ہے، ہمارے لائق دوست ڈاکٹر محمد عزیز صاحب نے کئی سال ہوئے اس موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھا تھا جس کو انجمن ترقی اردو نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے، یہ کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے مذہبی و تمدنی اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی کا ایک نتیجہ اردو زبان بھی ہے، اس کے بعد مختلف ابواب میں مذکورۂ بالا مذاہب اور فرقوں کے اصول و عقائد، ان کی مذہبی کتابوں اور مذہبی تعلیمات کا مختصر حال ہے، ان مذاہب کی کتابوں

کے اردو تراجم، ان کی شرحوں اور ان پر مستقل تصانیف کا ذکر ہے، اور ان کے اقتباسات دیے گئے ہیں، آخر میں ان مذاہب کے اردو اخبارات ورسائل کی فہرست ہے جس سے یہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان مذاہب کی تبلیغ میں اردو کا کس قدر حصہ ہے، اور اس میں ان کا کتنا مذہبی لٹریچر موجود ہے، اور یہ سب کتابیں نہایت صاف اور شستہ اردو میں ہیں، بعض کتابوں میں تو اردو دانوں کی تفہیم کے لیے اس قدر اسلامی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں کہ ان پر اسلامی کتاب کا دھوکا ہوتا ہے، اس کتاب میں ان ہی کتابوں کے اقتباسات دیے ہیں جو مؤلف کی نظر سے گذری ہیں جن کی تعداد چار سو کے قریب ہے، لیکن جو کتابیں ان کی نظر سے نہیں گذر سکیں، ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ کی اردو کتابوں کی فہرست میں جو ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۲ء میں مرتب ہوئی ہے، اس قسم کی کتابوں کی تعداد بارہ سو ہے اور یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہے، اسلئے کہ اس میں بعض قدیم اور ۱۹۰۲ء کے بعد کی تصانیف بالکل نہیں ہیں، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، اس سے اس خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے کہ اردو کسی خاص فرقہ یا طبقہ کی زبان ہے، اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی عام مشترک اور مقبول زبان اردو ہی ہے جس کا اعتراف ان کتابوں کے مصنفین اور مترجمین نے بھی کیا ہے، یہ کتاب اردو کے مخالفین کا ایسا مدلل جواب ہے کہ جس کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے، اس کتاب کے اس بنیادی مقصد سے قطع نظر یہ کتاب ہندوستان کے مذاہب کی تاریخ کی حیثیت سے بھی نہایت مفید، اردو کی اس مخالفت کے دور میں ایسی کتاب کی اشاعت اس کی بڑی خدمت ہے، جس کے لیے مصنف اور انجمن ترقی اردو دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

**تاریخ ادبیات ایران۔** مترجمہ جناب سید مبارز الدین رفعت صاحب ایم اے، تقطیع بڑی ضخامت ۶۰۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد لعہ غیر مجلد سے پتہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی۔



اردو میں فارسی ادبیات کی تاریخ پر اگرچہ شعر العجم، سخندان فارس، نگارستان فارس اور صنادید عجم وغیرہ متعدد کتابیں موجود ہیں اور براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کی بعض جلدوں کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے، مگر ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو فارسی ادبیات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو، اس دور کے ایک ایرانی صاحب قلم ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے "تاریخ ادبیات ایران بزرگ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو قبل از اسلام کے پہلوی دور سے لے کر قاچاریوں کے خاتمہ تک ایرانی ادبیات کی تاریخ پر مشتمل ہے، مذکورہ بالا کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے، کتاب کے پہلے باب میں پہلوی زبان وادب اور اس کے رسم الخط کی مختصر مگر محققانہ اور اس کے بعد مختلف ابواب میں اسلامی دور کے ادبیات کی مفصل تاریخ ہے، اسلامی دور کی تمہید میں ایران میں اسلامی حکومت کے قیام اور اس دور کے سیاسی حالات، عربی اور ایرانی تہذیب اور زبان وغیرہ پر ایک دوسرے کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر طاہری، صفاری، سامانی، غزنوی، سلجوقی، مغلی، تیموری، صفوی اور قاچاری وغیرہ مختلف دوروں کی الگ الگ تاریخ تحریر کی گئی ہے اور ہر دور کے ابتدا میں اس دور کے مختصر حالات اور زبان وادب کے تغیرات و ترقی وغیرہ پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، پھر اس کے شعراء وادباء، علماء و مصنفین کا مختصر حال اور شعراء کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے، اس کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اور ان کا نمونہ نقل کیا گیا ہے، اور مصنفین کی نثری تصانیف کا مختصر تعارف ہے، آخر میں دور مشروطیت پر اجمالی تبصرہ ہے، اس طرح اس کتاب میں اختصار و جامعیت کے ساتھ ایرانی ادبیات کی پوری تاریخ آگئی ہے، اس کتاب کے ترجمہ سے اردو ادب میں ایک مفید اور قابل قدر کتاب کا اضافہ ہوا، ترجمہ بہت صاف، سلیس اور رواں ہے،

**بیان القرآن۔** تقطیع بڑی، ضخامت ۱۱۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: شعبۂ اشاعت العلوم، ادارہ دی دیوبند یوپی۔

بیان القرآن مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور اردو تفسیر ہے، جو جملہ تفسیری

معلومات پر حاوی ہے، اردو میں جامعیت کے اعتبار سے اس پایہ کی کوئی تفسیر نہیں ہے، یہ عرصہ ہوا چھپی تھی، مگر اب کمیاب تھی، ادارۂ ہادی نے شائقین کی سہولت کے لیے اس کے مختلف حصے الگ الگ چھاپنا شروع کیے ہیں، یہ حصہ سورہ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل ہے، جن لوگوں کو اردو تفسیر کی تلاش ہو ان کے لیے اس تفسیر کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

**آتش**۔ سید ظہیر احسن صاحب ایم اے، لکچرار شعبۂ اردو و فارسی، سید انند کالج اورنگ آباد ضلع گیا تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: اقبال بک ڈپو، پٹنہ نمبر ۴۔

یہ کتاب جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے، آتش کے حالات اور انکی شاعری پر ہے، مصنف نے اس سلسلہ میں پہلے آتش کے زمانہ کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حالات لکھے ہیں، پھر غزل کی تعریف، لکھنویت، آتش کے کلام کی خصوصیات، اس کے بارہ میں ناقدین کی رایوں، آتش و ناسخ کے موازنہ اور انکے مشہور تلامذہ وغیرہ مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں آتش کی چند منتخب غزلیں نقل کی ہیں، مصنف ہونہار نوجوان ہیں، ان میں لکھنے کی خاصی صلاحیت ہے مگر ابھی نومشق ہیں، خیالات میں پختگی و توازن اور رطب و یابس میں امتیاز نہیں ہے، تحریر میں بھی خامیاں ہیں، انھوں نے اردو شاعری، لکھنویت اور آتش کے بارہ میں قدیم و جدید ناقدین کے یہاں جو کچھ پڑھا ہے اسکو بغیر کسی امتیاز کے جسطرح بن پڑا ہے کاغذ پر نقل کر دیا ہے، جس سے بہت سی غیر ضروری بحثیں آگئی ہیں، تاہم یہ کتاب فائدہ سے خالی نہیں ہے، اور اس میں آتش اور انکی شاعری کے متعلق بعض مفید معلومات بھی ہیں، اگر مصنف کا مطالعہ اور مشق جاری رہی تو ان میں ترقی کی پوری استعداد موجود ہے۔

م

---

## ضروری اعلان

پاکستان کے خریداران معارف کو اطلاع دیجاتی ہے کہ وہ آئندہ معارف کی سالانہ قیمت مکتبۃ الشرق کراچی کو نہ بھیجیں، بلکہ دفتر سے خریداروں کے پاس بل بھیجا جائیگا، اور وہ کسی قریبی بینک میں اس بل کا روپیہ جمع کر کے اسکا ڈرافٹ دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے نام بنوا کر دفتر معارف کو بھیجدیں۔

منیجر



جلد ۷۷ ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۶ء عدد ۴

فہرست مضامین